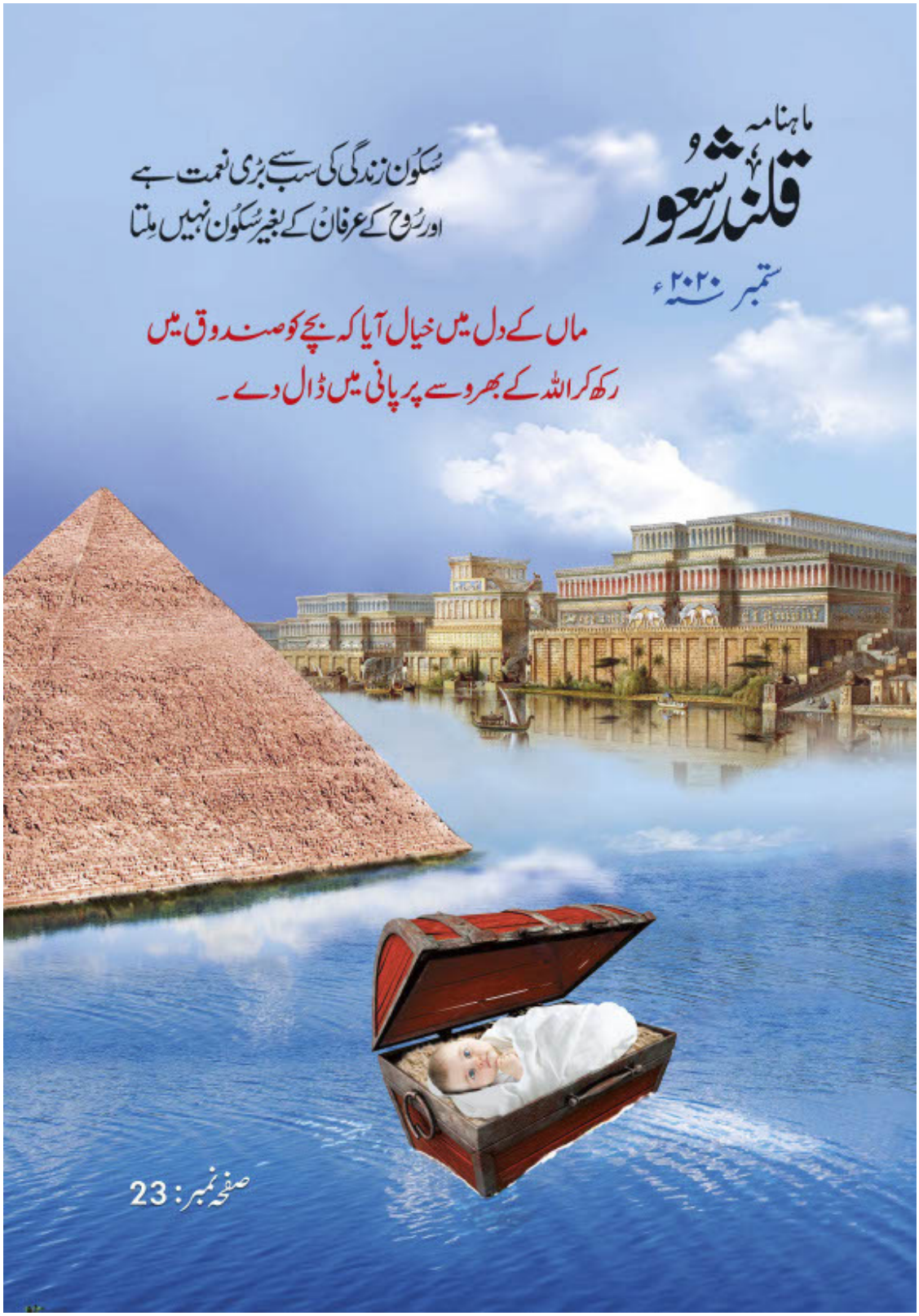

ماہنامہ
قلندر شعور
ستمبر ۲۰۲۰ء
سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا
ماں کے دل میں خیال آیا کہ بچے کو صندوق میں
رکھ کر اللہ کے بھروسے پر پانی میں ڈال دے۔
صفحہ نمبر: 23

جلد 8 شمارہ 8 | ستمبر 2020ء | محرم — صفر 1442ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ قلندر شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو—انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

باہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس—پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 80 روپے.....سالانہ ہدیہ 1080 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 70 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

۳۶ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ	احسان دانش	10
نعت رسول مقبول ﷺ	عاصم گیلانی	11
رباعیات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ	12
آج کی بات	مدیر مسئول	14
فقیر کی ڈاک	ادارہ	18
نامے میرے نام	خانوادہ سلسلہ عظیمیہ	20
موجیں ★ گھوارہ	(M.Phil Supply Chain) بلال حسن	23
ایٹم خلا ہے	بی بی انورادھا	29
کہن، سنن، کرن	عابد محمود	35
پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل	خواجہ شمس الدین عظیمی	41
خلق کا خدمت گزار ہے پانی	(M.A Fine Arts) حامد ابراہیم	45
اساتذہ کرام ــــ السلام علیکم	محمد فرحان	51
روٹی خور ــــ؟	ادارہ	57
خوش خبری سنائیں ہوائیں	(M.Sc. Zoology) زاہدہ تبسم	61
کس نے کہا اور کس نے سنا	عرفانہ شہزاد	67
وقت، رات کا تھا	(M.A I.R) نادیہ افتخار	75
سوچ میں سوچ	(Ph.D.) ڈاکٹر نعیم ظفر	79

فرشتے ——— (MBA) سید اسد علی 85
آواز میں بند شخصیت ——— ناصر علی 91
اقتباسات ——— قارئین 96
انگور کھٹے ہیں — ؟ ——— نیرّ اعظم 97
پورب کے ہم زاد ——— (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 101
پنجاب کے عوامی گیت ——— عبدالسلام خورشید 109
بخش دو گر خطا کرے کوئی ——— نفیسہ شاکر 113
جولائی 2020ء کے سرورق کی تشریح ——— قارئین 119

اللہ میاں کے باغ کے پھول —
اولی الالباب بچے ——— ادارہ 122
سورج — چہرہ ——— افشاں عزیز 125
چار سوال — جواب؟ ——— بی بی ایمن 130

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ——— خواجہ شمس الدین عظیمی 135

Circle of Life ——— Bibi Anuradha (UAE) 145
The Positive Effects of Plants ——— Moeed Ahmad 149
The Seeker of Peace ——— Qurat-ul-ain Wasti 156
The Drum ——— Roshan Sitara 159
Unity in Diversity ——— Umar Tariq 164
Inferiority Complex ——— Mahnoor Arif 168
Message of the Day ——— K.S.Azeemi 172

حمد باری تعالیٰ

احسان دانش

تری حمد میں کیا کروں اے خدا
مرا علم کیا ہے، مری فکر کیا

میں ہوں بے خبر تو خبیر و علیم
میں حادث ہوں اور ذات تیری قدیم

مکاں ہے ترا لامکاں ہے ترا
زمیں ہے تری آسماں ہے ترا

تجھی سے صبا ہے تجھی سے سموم
زمیں پر ہیں گل آسماں پر نجوم

ضیائے رخِ زندگی تجھ سے ہے
جہاں بھی ہے رخشندگی تجھ سے ہے

محیطِ دو عالم ہے قدرت تری
ہے کثرت کے پردے میں وحدت تری

ترے زمزمے آبشاروں میں ہیں
تری عظمتیں کوہساروں میں ہیں

تری حمد میں کیا کروں اے خدا
مرا علم کیا ہے، مری فکر کیا

نعت رسول مقبول ﷺ

عاصم گیلانی

ان کی رضا پہ جو بھی رضامند ہوگئے
مقبول بارگاہِ خداوند ہوگئے

اٹھا جو سیل اشک تو پلکوں کو سی لیا
گویا گہر صدف میں نظربند ہوگئے

آزاد ہوگئے غمِ روزِ حساب سے
جو لوگ ان کے لطف کے پابند ہوگئے

سارے جہاں کے درد سمٹ کر بصد نیاز
ان کی قبائے پاکؐ کے پیوند ہوگئے

اس آستانِ پاکؐ کا اللہ رے فیض عام
جو دل زدہ بھی آگئے خورسند ہوگئے

آقاؐ کے در سے ان کو ملی منزلِ مراد
جن پر نشاطِ زیست کے در بند ہوگئے

ان کی رضا پہ جو بھی رضامند ہوگئے
مقبول بارگاہِ خداوند ہوگئے

انتقالِ مکان

حق یہ ہے کہ بے خودی خودی سے بہتر
حق یہ ہے کہ موت زندگی سے بہتر
البتہ عدم کے راز ہیں سربستہ
لیکن یہ کمی ہے ہر کمی سے بہتر

''دیکھ لو دنیا میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر کیسی فضیلت دی ہے اور آخرت میں اس کے درجے اور زیادہ ہوں گے اور اس کی فضیلت اور زیادہ ہوگی۔'' (بنی اسرآءیل:۲۱)

سمجھا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی وہ صلاحیتیں جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے موت کی زندگی سے متعارف ہونے کے بعد متحرک ہوتی ہیں۔ موت باطن میں اس قدر خوش نما اور حسین ہے کہ اس کے اوپر ہزار جانیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ موت سے تعارف ایسا عمل ہے جو حاصلِ زندگی ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں داخل ہو کر انسان زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد ہو کر تصور اور خیال کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ ہوائی جہاز کی ضرورت ہے نہ اسپیس شپ کی۔ انسانی زندگی کا یہ وصف جس کا نام موت ہے سب کا سب غیب ہے۔ یہ وصف انسان کو زمانی اور مکانی قید سے آزاد کر کے ایسی کیفیات سے روشناس کرتا ہے جہاں ارادہ حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آدمی کی خواہش یہ ہے کہ وہ سیب کھائے تو اس کے لئے صرف سیب کھانے کا ارادہ کر لینا سیب کی موجودگی کا باعث بن جاتا ہے۔ عالم قید و بند (دنیا) میں کوئی آدمی وسائل کی پابندی کے بغیر سیب نہیں کھا سکتا۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اس رباعی میں اسی نکتہ کو بیان کیا ہے۔ نوعِ انسانی کی عادت ہے کہ وہ اکثریت کے تجربات کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے اور جو اکثریت کا فیصلہ ہوتا ہے وہی حق قرار پاتا ہے۔ یہی معاملہ موت اور بے خودی کا ہے۔ اکثریت موت کے عمل اور موت کے تذکرے سے خائف رہتی ہے اور اس کو اپنی خودی یا انا کا خاتمہ تصور کرتی ہے۔ یہی معاملہ خودی اور بے خودی کا ہے لیکن وہ لوگ جو اس زندگی میں رہتے ہوئے موت کے بعد کی زندگی میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی آزاد اور خوشی سے معمور ہے۔ اگر مرنے سے پہلے موت کے بعد کی زندگی روشن ہو جائے تو کوئی شخص اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کرے گا اور اس مادی دنیا پر ویرانی چھا جائے گی اس لئے نوعِ آدم موت کے بعد کی دنیا سے واقف ہونا نہیں چاہتی جب کہ موت دراصل انتقالِ مکان ہے۔

آج کی بات

فقیر گزشتہ آٹھ سالوں سے مختلف زاویوں اور مثالوں سے 'آج کی بات' میں اصل زندگی کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ آپ کیا سمجھے، زندگی کیا ہے ــــ؟

تالاب کے پاس جائیے اور کنکر پھینکئے۔ کنکر جیسے ہی پانی کو توڑتا ہوا نیچے جاتا ہے، دائرے بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلا دائرہ بہت چھوٹا، دوسرا دائرہ اس سے بڑا ہوتا ہے۔ دائرے اس قدر بڑھتے ہیں کہ تالاب پر محیط ہو جاتے ہیں۔

قارئین! تالاب میں کنکر پھینکتے وقت آپ آواز سنیں گے ــــ ٹپ!

کنکر جس مقام پر پانی کے اندر اترے گا، وہاں معمولی بلبلا بنے گا۔ بلبلا کھلے گا اور دائرے بننا شروع ہوں گے۔ تالاب کے بیچ میں بننے والا چھوٹا دائرہ تالاب کی وسعت کے مطابق بڑا ہوتا رہتا ہے۔ ہر دائرہ منفرد ہے اور اس میں متعین فاصلہ رہتا ہے۔ دائرے تالاب کے مرکز سے شروع ہوتے ہیں اور کنارے پر جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی دائرے سے شروع ہوتی ہے اور کنارے پر آ کر گم ہو جاتی ہے۔

ربِ کائنات کا ارشاد ہے:

''وہی اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' (الحدید:۳)

تالاب میں بننے والے دائرے غیب سے ظاہر ہوتے ہیں اور غیب میں غیب ہو جاتے ہیں۔

مشق نمبر ۱: سفید کاغذ لیجئے، پنسل یا پرکار سے دائرہ بنائیے۔ اوپر شمال، نیچے جنوب، دائیں طرف مشرق اور بائیں جانب مغرب لکھئے۔ اس دائرے کو بیچ سے کاٹئے، دو حصے ہو جائیں گے۔ اب یہ دائرہ نہیں، دو مثلث ہیں۔ مثلث بناتے رہئے یہاں تک کہ دائرے کے اندر خلا مثلث سے بھر جائے۔

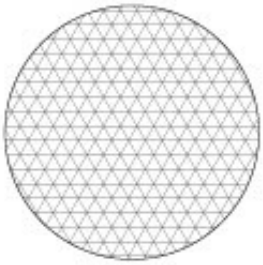

پلک جھپکائے بغیر نظر دائرے پر مرکوز کر دیں۔ جب نظر ٹھہرے گی تو آپ کو دائرے کے اندر بنی ہوئی لکیریں مختلف شکلوں میں نظر آئیں گی۔ اگر تمام مثلث مٹا دیں تو وہاں سوائے کاغذ کے کچھ نظر نہیں آئے گا۔

(قانون) لکیریں بننے سے دائرے میں تصویریں ظاہر ہوتی ہیں ــــ لکیریں* مٹتی ہیں تو تصویریں غائب ہو جاتی ہیں۔

•• ———————— ••

مشق نمبر ۲: آدھا گلاس پانی لیجئے۔ چار پانچ فٹ کے فاصلے سے سفید دیوار پر پانی پھینکئے، اس طرح کہ دیوار پر پانی لگنے کی آواز سنائی دے۔ اب بیٹھ کر نہیں، کھڑے ہو کر دیوار کو غور سے دیکھئے۔ زیادہ مناسب ہے کہ پلکیں نہ جھپکیں۔ پلک جھپک جائے تو دوبارہ کوشش کیجئے۔ دیوار کے اوپر پانی کے نقوش تصویروں میں نظر آئیں گے۔ مثلاً درخت، آدمی، بادل، اونٹ وغیرہ۔

---

* لکیروں سے مراد لہریں ہیں۔

میری آنکھوں کی روشنی ــــ مرشد کریم ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے اسباق کے دوران جب یہ فارمولا بتایا تو میں نے تجربہ کیا اور دیوار پر نقوش کا جو عکس نظر آیا، وہ پانی پھینکنے سے پہلے نہیں تھا۔ میں نے اس مشق سے زندگی کو سمجھا۔

قارئین! بتایئے آپ نے اس مشق سے کیا سیکھا ــــ؟

•• ———————— ••

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو سننے، دیکھنے، بولنے اور چھونے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس کے بارے میں مرشد کریم قلندر بابا اولیاؒ نے رات کے ڈھائی تین بجے اسباق کے دوران مجھ عاجز بندے سے فرمایا،

''جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو الفاظ ہونٹوں سے باہر آتے ہیں، وہ کسی جگہ ٹکراتے ہیں۔''

آواز جب تک کسی مقام سے نہ ٹکرائے، سنائی نہیں دیتی جب کہ آواز موجود ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آواز جس مقام سے ٹکراتی ہے، وہ کیا ہے، کہاں ہے اور نظر کیوں نہیں آتا؟ ٹکرانے کے بعد آواز سنائی دینے میں تغیر ہوتا ہے۔ سوچئے کہ تغیر کیا ہے؟

مثال: پروجیکٹر سے روشنی نکل کر فلم کے فیتے پر پڑتی ہے، فیتے پر بنی تصویروں کا عکس لے کر پروجیکٹر کے سامنے بنے گول سوراخ میں سے گزر کر اسکرین پر بکھرتی ہے اور ہم فیتے میں ریکارڈ تصویروں کا عکس اسکرین پر دیکھتے ہیں۔

قارئین! سنیما دیکھنے کے دوران کچھ دیر اوپر دیکھئے۔

•• ———————— ••

تفکر کیجئے کہ دیکھنے کا میکانزم کیا ہے۔ جب ہم پانی کہتے ہیں تو سننے والے کی سماعت میں پ ا ن ی کے بجائے دماغ میں پانی کی تصویر بنتی ہے۔ پانی کی جس شکل سے ہم مانوس ہیں، وہ نظر آتی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ الفاظ ذہن میں داخل ہونے سے تصویر بنتی ہے

اور تصویریں بات کرتی ہیں۔ آواز تصویریں منتقل کرنے کا میڈیم ہے۔ ہم ذہن کی اسکرین پر تصویر دیکھ کر مفہوم سمجھتے ہیں۔

مرشد کریم کے ارشادات پر مجھ عاجز بندے نے غور کیا تو ذہن میں آیت انسپائر ہوئی۔

''اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ کا ہے اور اللہ ہر شے پر محیط ہے۔'' (النسآء: ۱۲۶)

خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ صاحبِ قدرت ہیں اور قدرت کے دائرے میں معدنیات، نباتات، جمادات، حیوانات، حشرات، جنات، سماوات، ملائکہ، زمین، آدمی اور انسان سب موجود ہیں۔ یہ مخلوقات اس وقت نظر آتی ہیں جب دائرے میں لکیریں بنتی ہیں۔ لیکن ہر نشان جو مثلث کی شکل میں موجود ہے، وہ دائرے کے اندر ہے۔

''اللہ ہر شے پر محیط ہے۔''

اللہ کی صفت محیط ہے۔ محیط سے مراد ہر طرف سے شے کا احاطہ کرنا ہے۔ ابدالِ حق نے کتاب 'لوح وقلم' میں لکھوایا ہے کہ محیط ہونے کا اصل مفہوم اول، آخر، ظاہر اور باطن ہے۔

اللہ ابتدا ہے، اللہ انتہا ہے، اللہ ظاہر ہے اور اللہ باطن ہے۔

ابتدا ــــ انتہا ــــ ظاہر ــــ باطن جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو خلا ◯ بنتا ہے۔

دائرے کے اندر نقوش مخلوقات کا مظاہرہ ہیں اور مظاہرے پر دائرہ محیط ہے۔

قارئین خواتین وحضرات! وضو کر کے شمال رخ بیٹھ کر 'آج کی بات' پر غور کیجئے۔ دیکھنے کا قانون تحریر میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں 'آج کی بات' میں تخلیق سے متعلق قوانین بیان ہوئے ہیں، ان کی تعداد بتایئے۔

اللہ حافظ

نوٹ: اگر کچھ پوچھنا ہے تو ادارہ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

فقیر کی ڈاک

تفکر ــــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ــــ عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

قابلِ احترام، محترم ومکرم عظیمی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

چند ماہ سے 'ماہنامہ قلندر شعور' پڑھ رہا ہوں۔ اسے پڑھنے سے ایسی بہت معلومات ملی ہیں جن سے میں لاعلم اور غافل تھا۔ مطالعے کے دوران ذہن میں سوالات آتے ہیں۔ یقیناً آپ نے اپنی تحریروں اور خطبات میں ان پر اظہار خیال فرمایا ہوگا۔ چند سوالات ارسال کر رہا ہوں۔

۱۔ قبر کا عذاب روح پر ہوتا ہے یا جسم پر؟

۲۔ 'نفسِ امارہ' میں جسم غالب ہوتا ہے اور روح مغلوب ہو جاتی ہے۔ روح توانائی (انرجی) ہے۔ جسم روح کے بغیر کچھ نہیں پھر جسم روح پر کس طرح غالب ہو جاتا ہے؟

۳۔ خواب میں زید بکر سے ملتا ہے۔ دونوں بہت سے مقامات پر جاتے ہیں۔ بیدار ہونے پر زید اس خواب کا ذکر بکر سے کرتا ہے مگر بکر لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ خواب میں کون کس سے ملتا ہے؟

۴۔ جنت سے نکلنے کی ایک وجہ گوشت پوست کا جسم ہے۔ یہ جسم شجرِ ممنوعہ کے پاس جانے سے ظاہر ہوا۔ کیا جنت میں آدمی اس جسم کے ساتھ جائے گا؟

آپ کی توجہ کا طالب، فاروق بٹ۔ کراچی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

دین میں جبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ منتخب کرے جن پر اللہ کا انعام

ہوا یا ان لوگوں کا راستہ جن کا انجام غیظ وغضب ہے۔ جسم سڑی ہوئی بجنی مٹی سے بنا ہے۔ سڑی ہوئی بجنی مٹی بھی شکل وصورت اور صفات رکھتی ہے۔ دوسری طرف روح خالص وجود ہے جس میں تغیر نہیں۔ آدمی جو صفات اختیار کرتا ہے، وہ غالب ہو جاتی ہیں اور دوسری صفات مغلوب رہتی ہیں۔ مغلوب سے مراد یہ ہے کہ آدمی ان صفات کے استعمال سے واقف نہیں۔

راحت اور تکلیف زندگی کے دو رخ ہیں۔ تکلیف نافرمانی ہے اور مسرت فرماں برداری ہے۔ اگر ہم اچھا کام کرتے ہیں تو وہ ریکارڈ ہوتا ہے لیکن اگر ہم برا کام کرتے ہیں، وہ بھی ریکارڈ ہوتا ہے۔

''پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔'' (الزلزال: ۷۔۸)

دنیا میں دو طرزیں ہیں۔ ایک طرز کے استعمال میں تکلیف اور الوژن ہے اور دوسرا زاویہ راحت و آرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو خیر اور شر دونوں پر اختیار دیا ہے۔ خیر ہے تو زندگی ثمر ہے، شر ہے تو زندگی کانٹوں بھرا بیج ہے۔ ہم جہاں موجود ہیں وہ مقام الوژن ہے اور الوژن میں مستقل تغیر ہوتا ہے۔ تغیر کا مطلب ہے ایسی شے جو مستقل ردّ و بدل ہوتی رہے۔ جہاں تک جسم کا تعلق ہے جسم کی حیثیت اس وقت مشکوک ہو جاتی ہے جب ایک دن کا بچہ 10 سال کا ہوتا ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے غیب میں تھا اسی طرح غیب میں چلا جاتا ہے۔

اس بات کو اس طرح سمجھئے کہ آپ نے قمیص شلوار پہنی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن اس کے اوپر وقت کی چھاپ بڑھنے سے کپڑا گل جائے گا اور بالآخر کپڑا نہیں رہے گا۔ یہی حاصل جسم کا ہے۔

جسم کی تعریف یہ ہے کہ ایک طرف مسلسل اس کا وجود ظاہر ہو۔ ایک دن کا وجود غائب ہو کر دوسرے دن کے وجود میں ظاہر ہو۔ ظاہر غیب کی زنجیر کی ہر کڑی ظاہر ہوتی ہے اور غیب ہو جاتی ہے۔ ہم قبر میں لاش محفوظ کرتے ہیں، دراصل وہ احترامِ انسانیت کے لئے ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ معین عرصے کے بعد اگر قبر کھولی جائے تو وہاں مٹی کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آتی۔ لیکن جس نے لباس پہنا ہے ــــ؟

دعا گو، عظیمی (22 جون 2020ء)

نامے میرے نام

کرم فرما خواتین وحضرات نے ''ماہنامہ قلندر شعور'' کو دل کی گہرائیوں سے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قبول فرما کر روپ بہروپ کو دلہن کا روپ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قارئین کی خدمت کی توفیق دیں۔ رابطے کے قدیم وجدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط میں سے منتخب خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔

اگست 2020ء کے 'آج کی بات' پر موصول شدہ تفکر میں سے منتخب خطوط:

شاہنواز علی (ملتان): شہنشاہ ہفت اقلیم نانا تاج الدین ناگپوریؒ فرماتے ہیں ــــ ''کہنے میں یہی آتا ہے کہ ستارے ہمارے سامنے ہیں، ستاروں کو ہم دیکھ رہے ہیں، ہم آسمانی دنیا سے روشناس ہیں۔ لیکن ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور ماہ وانجم کی کون سی دنیا سے روشناس ہیں، اس کی تشریح ہمارے بس کی بات نہیں۔'' زمین کے شعور میں رہنے والا آسمانی دنیا کو نہیں دیکھتا۔ آسمان کا شعور اور قوانین الگ ہیں۔ زمین کے شعور سے آسمان کو دیکھ کر رائے قائم کرنا قیاس آرائی ہے۔ عام آدمی یا علمِ فلکیات کا ماہر اگر آسمانی شعور کی آگہی نہیں رکھتا تو اس نے اب تک سورج، چاند اور ستاروں کے بارے میں جو کچھ لکھا اور سمجھا ہے پھر وہ کیا ہے؟

شائستہ کوثر (متحدہ عرب امارات): استاد اور شاگرد کی تمثیل نے نانا تاج الدین ناگپوریؒ کے قول کو بلیغ انداز میں سمجھایا ہے۔ لفظ 'دل فریب' لگ بھگ سب کی زبان پر ہوتا ہے لیکن ہم کیا کہتے ہیں اور ان لفظوں کا مفہوم کیا ہے، ہم ناآشنا ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ 'دل فریب' تعریفی الفاظ ہیں حالاں کہ ان کے ذریعے ہم غیر ارادی طور پر شے کے غیر حقیقی ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

★ چاند کی رونق کو دل فریب کہا جاتا ہے۔ قارئین! بتایئے دل فریب کا مطلب کیا ہے؟

جہاں زیب فیصل (کراچی): قدرت نے چاند کی منازل محدود شعور کی آسانی کے لئے متعین کی ہیں۔ قدرت چاند کو غور سے دیکھنے والوں کی راہ نمائی کرتی ہے کہ چاند ہمہ وقت مکمل حالت میں موجود ہے۔

انور خالد (شہر کا نام نہیں لکھا): سوال پوچھا گیا ہے کہ پردہ چاند پر سے ہٹتا ہے یا ہماری نظر سے۔ جواب یہ

ہے کہ چاند کا پہلا اور آخری دن پوری رعنائیوں کے ساتھ آسمان پر ہے۔ جن لوگوں کی نگاہ روشن ہے وہ آسمانی دنیا کی زینت دیکھ لیتے ہیں اور جن کے ذہن میں تاریکی ہے، وہ چاند کے شعور سے لاعلم ہیں۔

★ اللہ تعالیٰ سورہ حجر کی آیت ۱۶۔۱۷ میں فرماتے ہیں، ''ہم نے آسمان کو بروج سے زینت بخشی دیکھنے والوں کے لئے اور چھپا لیا اسے شیطان مردود سے۔'' قارئین! بروج کی زینت کو چھپا لیا شیطان مردود سے کا مطلب کیا ہے؟ قرآن کریم کی اس آیت پر غور کیجئے اور غور میں تفکر ہونا ضروری ہے۔ انشاء اللہ! پٹ کھلیں گے۔

مریم الیاس (کراچی): سمتوں کے مغلوب ہونے کا مطلب اپنی نفی ہے۔ اپنا اثبات کر کے درحقیقت ہم ایک سمت کا تعین کرتے ہیں۔ اگر ہم شمال کی طرف ہیں تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شمال کے متضاد رخ پر جنوب ہے۔ خود کو دیکھنے کی وجہ سے دوسرے ہمیں نظر آتے ہیں۔ نظر اپنی سمت سے ہٹ جائے تو ساری سمتیں غائب ہو جاتی ہیں۔

★ — ★ — ★

★ دیگر مضامین پر خواتین و حضرات قارئین کی آرا پڑھئے۔

محمد رفیق (نیویارک): ڈاکٹر نعیم ظفر صاحب اپنے مضامین میں روحانیت اور سائنس دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں کہ تغیر اور غیر متغیر سوچ کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نیا قسط وار مضمون 'سوچ میں سوچ' پڑھا۔ کائنات سے ہمارا رابطہ سوچ کے ذریعے ہے۔ سوچ خیال کا دوسرا نام ہے۔ زندگی خیال سے شروع ہوتی ہے، اس کی پیلٹ پر آگے بڑھتی ہے اور دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ خیال کے میکانزم کو بیدار کرنے کی مشق مراقبہ ہے۔

ایک قاری (کوئٹہ): گزارش ہے کہ 'آج کی بات' کو آسان الفاظ میں پیش کیا جائے۔

★ محترم قارئین! اس سلسلے میں اپنی رائے سے مطلع کریں۔

خدیجہ (لاہور): مضمون 'خط — اللہ کے نام' پڑھا، دل خوش ہوا۔ ٹوٹے دلوں کو لازوال محبت کی راہ دکھائی گئی ہے۔ یہ نئی نسل کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ قبر کا منظر پڑھ کر مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔

شمع خاتون (کراچی): پہلے مضمون سے لے کر خواب کی تعبیر تک ہر تحریر پُر مغز ہے۔ خواب اور تعبیر پڑھنے سے ذہن سامنے آجاتا ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، خواب کی دنیا اس کا عکس ہے۔

محمد عثمان (جماعت ششم): تجویز ہے کہ بچوں کے لئے علیحدہ رسالہ جاری ہونا چاہئے۔

اورنگ زیب (مردان): حامد ابراہیم صاحب نے خدوخال کی مدد سے دائرے اور مثلث کا قانون سمجھایا

ہے۔ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ بچے کی تصویر پر دائرہ غالب ہے۔

پروفیسر طاہر (چنیوٹ): 'خط ــــ اللہ کے نام' لاجواب مضمون ہے۔ تحریر اللہ سے محبت اور تشکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اکثر مضامین کے آخر میں مضمون کا خلاصہ مختصر الفاظ میں بیان ہوتا ہے جو غور و فکر میں بہت مفید ہے۔

آصف جاوید (اسلام آباد): قرآن کریم میں کائنات اور نوعِ آدم کی پیدائش سے متعلق تین واقعات ہیں۔

۱۔ کائنات کا آغاز کُن سے ہوا ۲۔ 'الست بربکم' کا واقعہ ۳۔ آدم کی تخلیق، فی الارض خلیفہ اور علم الاسماء

اللہ نے آدم کو زمین پر خلیفہ بنایا اور علم الاسماء عطا کیا، اس کو باقی دو واقعات کی روشنی میں کیسے سمجھیں؟

★ قارئین سے درخواست ہے کہ آصف جاوید صاحب کے سوال کا جواب لکھئے۔

غلام اصغر (اسلام آباد): ہم دوست قرآن کریم ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہیں اور غور کرتے ہیں، کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ ذہن کھل رہا ہے۔ دعا کی درخواست ہے۔

عمیر ریحان (لاہور): محترم عظیمی صاحب! کتاب 'صدائے جرس' کے ایک مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ سورج اور چاند کے ساتھ تعلق استوار کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ تعلق کیسے استوار کیا جائے تاکہ ہم ان سے بات کریں اور وہاں کی سیر کریں؟

★ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۰ اور ۱۹۱ پڑھئے اور اس پر عمل کیجئے۔

محمد فائق (کراچی): 'ماہنامہ قلندر شعور' کے سرورق سائنسی اور روحانی قوانین کی منفرد عکاسی کرتے ہیں۔ دائرہ اور مثلث زندگی کے دو رخ ہیں۔ دائرہ جب کلاک وائز گھومتا ہے تو مثلث بنتے ہیں۔ دائرہ اینٹی کلاک وائز گھومنے سے مثلث غائب ہو جاتے ہیں۔ اہم بات حرکت کے رخ کی ہے۔ مثلث ایک طرح سے طلسماتی دنیا ہے جس کے بارے میں حضور قلندر بابا اولیاؒ نے فرمایا ہے کہ ــــ دنیائے طلسمات ہے ساری دنیا۔

حمدہ حسن (لاہور): مضمون 'خط ــــ اللہ کے نام' عشق و محبت کے فلسفے پر معاشرے میں رائج سوچ پر ضرب ہے۔ اسے پڑھ کر محبت کا حقیقی مفہوم واضح ہوتا ہے۔

اقصیٰ قیصر (پشاور): مضمون 'بانجھ پن' میں بی بی یوحنہ کے واقعہ میں مخفی قانون پڑھ کر ذہن دنگ رہ گیا۔ نادیہ افتخار صاحبہ کا مضمون بھی پسند آیا اور 'اندر میں سیر کیجئے' معلوماتی تحریر ہے۔ بی بی انور ادھا اچھا لکھ رہی ہیں۔ ناصر صاحب کی تحریر 'پوتوں اور نواسوں کا سوال' پڑھ کر کافی دیر سوچا کہ میں کون ہوں۔

بلال حسن

موجیں ★ گہوارہ

اِس وقت پانی کی سطح بچے کے لئے گہوارے سے زیادہ راحت بخش ہے۔ دریا کا سیلاب اس کی دایہ ہے اور دریا کی موجیں آغوشِ مادر بنی ہوئی ہیں۔ دیکھو! دریاؤں میں اپنے ارادہ واختیار سے طغیانی نہیں آتی۔ دریا ہمارے حکم کے مطیع ہیں، وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہوتا ہے۔

بادشاہِ مصر فرعون کو خواب کی تعبیر نے حواس باختہ کر دیا۔ نجومیوں نے بتایا کہ ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں تیری سلطنت کا خاتمہ ہوگا۔ اقتدار خطرے میں دیکھ کر فرعون نے حکم دیا کہ اسرائیلی گھرانوں میں جو لڑکا پیدا ہو، قتل کر دو۔

حکم ملتے ہی کئی بچے قتل ہوئے۔ ظلم دیکھ کر رعایا خوف زدہ ہوگئی۔ سب کی کوشش تھی اگر بیٹا پیدا ہو تو خبر گھر سے نہ نکلے۔ ہر طرف شاہی جاسوسوں کا جال تھا۔ جہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا، انہیں خبر ہو جاتی۔

عمران اور بی بی یوکبد کے بچے کی پیدائش قریب تھی۔ بیٹا پیدا ہوا تو گھر والے سخت پریشان ہوگئے۔ خبر تین مہینے تک چھپا کر رکھی لیکن اندازہ تھا کہ زیادہ دیر تک شاہی جاسوسوں سے بچنا مشکل ہے۔

فطرت کا دستور ہے کہ نظامِ الٰہی میں مداخلت کرنے والوں کے عزائم پلٹ دیئے جاتے ہیں۔

اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں فرمایا ہے،

''ہم چاہتے تھے کہ کم زوروں پر احسان فرمائیں اور انہیں پیشوا بنائیں، ان کو وارث بنائیں اور زمین میں اقتدار بخشیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی دکھا دیں جس کا انہیں ان کی طرف سے خطرہ ہے۔'' (القصص: ۵۔۶)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کی حفاظت کے لئے بی بی یوکبد کو حکم ہوا کہ،

''اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔ پھر تم کو اس کے بارے میں کچھ خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور خوف اور رنج نہ کرنا۔ بے شک ہم اسے تیرے پاس لے آئیں گے اور اسے رسول بنائیں گے۔'' (القصص: ۷)

بی بی یوکبد کے دل میں خیال آیا کہ صندوق بناؤ، اس پر لال روغن کرو اور بچے کو صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔ انہوں نے اللہ کا

نام لے کر بچے کو نیل کی موجوں کے حوالے کیا۔ دریا کی موجیں بچے کے لئے ماں کی گود بن گئیں۔

دریائے نیل کی طوالت تقریباً 6,695 کلومیٹر بتائی جاتی ہے۔ نیل اور امیزون دنیا کے سب سے طویل دریا شمار ہوتے ہیں تاہم دونوں میں زیادہ طویل کون سا ہے، ماہرین کہتے ہیں کہ اس کا تعین صرف طوالت سے نہیں کیا جاسکتا۔

دریائے نیل ــــ نیلِ ابیض اور نیلِ ارزق سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ دریا کا بیش تر پانی نیلِ ارزق سے آتا ہے۔ نیلِ ارزق ایتھوپیا میں جھیل ٹانا سے شروع ہوتا ہے اور جنوب مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے سوڈان سے گزرتا ہے۔ نیلِ ابیض وسطی افریقی ملک روانڈا کے جنوب سے نکلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ عظیم جھیلوں کا علاقہ ہے۔ نیلِ ابیض شمال کی جانب تنزانیہ، یوگنڈا اور جنوبی سوڈان سے گزرتا ہے۔ دونوں دریا سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب باہم ملتے ہیں۔ دریا کا شمالی حصہ سوڈان سے مصر تک صحرا میں سے گزرتا ہے۔ دریائے نیل مصر کے دارالحکومت قاہرہ اور دیگر شہروں سے گزرتے ہوئے ڈیلٹائی خطے میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح تقریباً 6,695 کلومیٹر کے سفر کے بعد بحیرہ روم میں گرتا ہے۔

جب بھی دریائے نیل کا ذکر آتا ہے، آنکھوں میں ان واقعات کا نقشہ گھوم جاتا ہے جو الہامی کتابوں میں مذکور ہیں۔ مذہب، تاریخ، ثقافت اور معیشت کے لحاظ سے یہ دریا ہزاروں سال سے تہذیب وتمدن کا حصہ ہے۔

قدیم مصر کے تقریباً تمام آثار قدیمہ دریائے نیل کے کناروں کے ساتھ ملتے ہیں۔ چار ہزار سال قبل مسیح میں صحرائے اعظم صحارا کی خشک سالی کے باعث مقامی باشندوں نے دریائے نیل کی جانب ہجرت کی جو عظیم مصری تہذیب کا پیش خیمہ بنی۔

نیل کی پُرشور موجوں نے صندوق کو جلد ساحل سے دور کر دیا۔ ماں کنارے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ محسوس ہوا کہ صندوق کی جگہ دل سینے سے نکل کر موجوں پر تیر رہا ہے۔ ایک موقع پر صبر نہ ہو سکا۔ اگر اس وقت اللہ کی رحمت ماں کو سکون وقرار نہ بخشتی تو وہ خاموشی توڑ دیتی اور راز کھل جاتا۔

''اور موسیٰؑ کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔ اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ وہ اس کو ظاہر کر دیتی۔ غرض یہ تھی کہ وہ مومنوں میں رہے۔''

(القصص:۱۰)

ان لمحات میں ماں کے دل پر جو گزری، اس کا نقشہ ایک فارسی شاعرہ نے فصاحت سے بیان کیا ہے۔

فارسی اشعار

مادر موسیٰؑ چو موسیٰؑ رابہ نیل
درفگند از گفتۂ رب جلیل
خود زساحل کرد باحسرت نگاہ
گفت کای فرزند خرد بی گناہ!
گر فراموشت کند لطف خدای
چون رہی زین کشتی بی ناخدای
وحی آمد کاین چہ فکر باطل است
رہرو ما اینک اندر منزل است
ماگرفتیم آنچہ را انداختی
دست حق را دیدی و نشاختی
سطح آب از گاہوارش خوشتر است
دایہ اش سیلاب و موجش مادراست
رودھا از خود نہ طغیان می کنند
آنچہ می گوئیم ما آن می کنند
ما بہ دریا حکم طوفان می دہیم
ما بہ سیل و موج فرماں می دہیم
نقش ہستی نقشی از ایوان ما است
خاک و باد و آب سرگردان ماست
بہ کہ برگردی بہ ما بسپاریش
کی تو از ما دوستری داریش؟
مادر موسیٰؑ چو موسیٰؑ رابہ نیل
درفگند از گفتۂ رب جلیل

اردو ترجمہ

جب حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے حکمِ الٰہی کے مطابق بیٹے کو دریائے نیل میں ڈال دیا تو وہ ساحل پر کھڑی ہو کر حسرت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ اے میرے بے گناہ ننھے بیٹے! اگر لطفِ الٰہی تیرے شاملِ حال نہ ہو تو اس کشتی میں تو کیسے سلامت رہ سکتا ہے جس کا کوئی ناخدا نہیں۔۔۔؟ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو اس وقت وحی ہوئی کہ یہ تیری کیا خام خیالی ہے۔ ہمارا مسافر تو سوئے منزل رواں ہے۔ ہم نے اسے اسی وقت سنبھال لیا تھا جب تو نے اسے دریا میں ڈالا تھا۔ تو نے خدا کا ہاتھ دیکھا لیکن پہچانا نہیں۔ اس وقت پانی کی سطح بچے کے لئے گہوارے سے زیادہ راحت بخش ہے۔ دریا کا سیلاب اس کی دایہ ہے اور دریا کی موجیں آغوشِ مادر بنی ہوئی ہیں۔ دیکھو! دریاؤں میں اپنے ارادہ واختیار سے طغیانی نہیں آتی۔ دریا ہمارے حکم کے مطیع ہیں، وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہوتا ہے۔ ہم سمندروں کو طوفانی ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ہم ہی سیلِ دریا کو روانی اور امواجِ بحر کو تلاطم کا فرمان بھیجتے ہیں۔ ہستی کا نقش ہمارے ایوان کے نقوش میں سے ایک نقش ہے۔ خاک، آب، ہوا اور آگ ہمارے اشارے سے متحرک ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بچے کو ہمارے سپرد کردے اور واپس چلی جا۔ کیوں کہ تو اس سے، ہم سے زیادہ محبت نہیں کرتی۔

الہامی پروگرام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی بہن موجوں کے ساتھ ساتھ دریا کنارے چلنے لگیں، نگاہ بہتے ہوئے صندوق پر مرکوز تھی۔ دریا سے ایک نہر فرعون کے محل کو جاتی تھی، صندوق اس نہر میں داخل ہوگیا اور بہتا ہوا محل کے تالاب تک پہنچا۔ ملکہ کی نظر پڑی۔ وہ نیک صفت تھی۔ صندوق تالاب میں سے نکالنے کا حکم دیا۔ جب کھولا گیا تو اس میں حسین اور صحت مند بچہ محو استراحت تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا۔ بچے کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں اور ممتا کے جذبات ابھر آئے۔ فرعون سمیت محل والوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں یہ وہ لڑکا تو نہیں جس کے بارے میں نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی۔

ممتا کے جذبات سے مغلوب ملکہ نے خدشات کو اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ممکن ہے یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ ملکہ نے بچے کا نام موسیٰؑ رکھا جس کے معنی ہیں، وہ شخص جو پانی سے نکالا گیا ہو۔

بچے کو دودھ پلانے کے لئے دایہ کا انتظام کیا گیا لیکن اس نے کسی دایہ کا دودھ نہیں پیا۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن دیکھ چکی تھیں کہ صندوق محل جا پہنچا ہے۔ ان کو خبر ملی کہ بچہ دودھ نہیں پی رہا۔ بہن نے محل میں جا کر ملکہ سے کہا کہ وہ ایسی خاتون کو جانتی ہیں جو بچے کی اچھی نگہداشت اور پرورش کریں گی۔

ملکہ کی اجازت سے وہ بی بی یوکبد کو محل لائیں۔ بچے نے ان (ماں) کا دودھ قبول کیا، اور انہیں دایہ مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

رحمٰن و رحیم اللہ کا ارشاد ہے:

''اور ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ احسان کر چکے ہیں جب ہم نے تیری والدہ کو الہام کیا تھا کہ بچے کو صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا۔ پھر اسے میرا دشمن اور اس بچے کا دشمن اٹھالے گا۔ اور ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا اور یہ اس لئے تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے، تیری بہن جب وہاں سے گزری تو اس نے کہا کہ میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اس کی پرورش کرے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہو۔'' (طٰہٰ: ۳۷۔۴۰)

دریا باشعور ہے۔ اس کی ہر موج، موج میں مدو جزر، توانائی، روانی، کشش و گریز کا عمل سب اپنی جگہ باحواس وجود ہیں۔ ایسا وجود جس کی شکل و صورت، ہاتھ پیر، کان، آنکھیں اور ناک، ریڑھ کی ہڈی، دل و دماغ وغیرہ ہیں۔ جس طرح ریڑھ کی ہڈی جسم کو توازن میں رکھتی ہے، چلنے پھرنے، بیٹھنے اٹھنے اور

لیٹنے میں مدد دیتی ہے اسی طرح لہریں اپنی پیٹھ پر روانی سے بڑے بڑے جہاز، چھوٹی بڑی کشتیاں اوران میں سامانِ تجارت لاتی اور لے جاتی ہیں۔ جہازوں کو کہاں مڑنا ہے، کتنا آگے جانا ہے اور کہاں پر رکنا ہے، اشارہ جہاز کی طرف سے ملتا ہے لیکن اگر دریا اور سمندر کی موجوں کا دل و دماغ ان اشاروں کو قبول نہ کرے اور پانی میں طغیانی آجائے تو کوئی جہاز ساحل تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہریں سنتی ہیں، دیکھتی ہیں، محسوس کرتی ہیں اور باتیں بھی کرتی ہیں۔ سننے، دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد ہی وہ اشارہ قبول کرتی ہیں اور اس سمت مڑ جاتی ہیں۔ مسافر سمجھتا ہے کہ وہ لہروں کو سمت دکھا رہا ہے — حقیقت یہ ہے کہ لہریں اللہ تعالیٰ کے حکم سے راستہ بنا رہی ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں لہروں کو اللہ تعالیٰ کا حکم ملا تو وہ صندوق کے لئے سواری بن گئیں اور اپنا رخ اس مقام (محل) کی طرف کرلیا جہاں سے حضرت موسیٰؑ کے دور کا آغاز اور فرعون کے اقتدار کا سورج غروب ہونا تھا۔

صندوق کا بچے کو لے کر بحفاظت محل تک پہنچنا اپنی جگہ اہم ہے تاہم اس میں سرگرمِ عمل قدرت کے تخلیقی فارمولے بھی غور طلب ہیں۔ جیسے:

۱۔ پانی کا بچے کی حفاظت کرنا
۲۔ لہروں کا صندوق کو دھکیلنا
۳۔ لہروں کا رخ محل کی طرف ہونا
۴۔ صندوق کا ڈوبنے سے محفوظ رہنا
۵۔ صندوق کا کشتی بن جانا
۶۔ لکڑی کا واٹر پروف ہونا
۷۔ واٹر پروف بنانے کا مسالا یا مٹی
۸۔ پانی اور لکڑی میں باہمی وزن کا قانون

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے 2400 سال قبل قدیم مصر میں Cyperus papyrus یعنی آبی نرسل پودے کا استعمال بہت عام تھا۔ اس کا تعلق آبی پودوں کی ایک قسم سے ہے اور اسے Nile grass بھی کہتے ہیں۔ یہ ان نباتات میں شامل ہے جو سب سے پہلے کاغذ بنانے کے لئے استعمال ہوئے۔ اس پودے کو قدیم مصر میں غذا، ادویات، فائبر اور پناہ گاہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ قدیم مصری اسے آرٹ اور کرافٹ، فرنیچر، چٹائی، رسی، باسکٹ اور کشتیاں بنانے میں بھی استعمال کرتے تھے۔ پانی روکنے کے لئے پپی رس فائبر سے رسیاں بناتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ پر 'توریت' نازل ہوئی۔ توریت میں اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے،

''اور لاوی کے گھرانے کے ایک شخص نے جا کر لاوی

کی نسل کی ایک عورت سے بیاہ کیا۔ وہ عورت حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ اور اس نے یہ دیکھ کر کہ بچہ خوب صورت ہے، تین مہینے تک چھپا کر رکھا۔ اور جب اسے اور زیادہ چھپا نہ سکی تو اس نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا۔ اور اسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی۔''

(توریت، کتاب: خروج، باب: ۲، آیت: ۱۔۳)

صندوق جس چیز سے بنا، توریت کے انگریزی ترجمے میں اس کے لئے Ark of Bulrushes کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آرک کو عبرانی زبان میں tebah کہتے ہیں۔ ٹیبہ مصری لفظ teb سے مماثل ہے جس کے معنی صندوق ہے۔ لفظ آرک عہد نامہ قدیم میں حضرت نوحؑ کی کشتی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ Bulrushes نرسل کی ہی ایک قسم ہے جس پر دریائے نیل کی چکنی مٹی لاپی گئی اور اسے رال یعنی تارکول سے لپیٹا گیا۔

آبی نرسل کی خاص بات یہ ہے کہ وزن میں بہت ہلکی ہے۔ جب کہ پانی کا وزن لکڑی سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکڑی نہیں ڈوبتی۔

خلاصہ: ماں کے دل میں خیال آیا کہ بچے کو صندوق میں رکھ کر اللہ کے بھروسے پر دریا میں ڈال دو۔ جب کوئی کام اللہ کے بھروسے پر ہوتا ہے تو کائنات اس کی تکمیل میں معاون بن جاتی ہے۔

شک اور یقین دو راستے ہیں۔ شک سے بندہ ڈوب جاتا ہے اور یقین تلاطم خیز موجوں میں سے گزار کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ ماں کے لئے بیٹے کو دریا کے سپرد کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو یقین کا قانون سکھایا کہ ڈر اور غم نہ کرو، اللہ پر بھروسا رکھو۔

چوں کہ بی بی یوکبد نے اللہ کے حکم کی تعمیل کر کے یقین کے راستے میں قدم اٹھایا تھا لہٰذا جس لمحے دل کم زور ہونے لگا، اللہ نے ڈھارس دے کر ان کی حفاظت کی اور آزمائش سے گزار دیا۔

''تو ہم نے اسے اس کی ماں کی طرف پھیرا کہ ماں کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور غم نہ کھائے۔ اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

(القصص: ۱۳)

قارئین! اس مضمون میں ایسی باتیں ہیں جن میں قانونِ قدرت بیان ہوا ہے۔ درخواست ہے کہ مضمون غور سے پڑھیں اور اس میں سے اہم باتیں تحریر کریں۔ (ادارہ)

بی بی انور ادھا

ایٹم خلا ہے

''اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے (بجنی) سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے۔'' (القرآن)

''مادہ (matter) کا تقریباً 99.9999999 فی صد حصہ خلا ہے۔ مادی جسم چوں کہ ایٹموں سے مرکب ہے لہٰذا ایٹموں کے اندر بڑا حصہ خالی ہے۔''

تحقیق دلچسپ ہے البتہ اس تحقیق کو اخذ کرنے اور اس پر یقین کرنے والے خواتین وحضرات کو خود سے پوچھنا چاہئے کہ جب ایٹم کا بیش تر حصہ خالی ہے پھر ایٹم سے بننے والا وجود جس میں آدمی شامل ہے، کی حقیقت کیا ہے—؟

تحقیق وتلاش وجود کو 99 فی صد سے زیادہ خلا بتاتی ہے۔ الہامی کتابوں سے علم ہوتا ہے کہ کائنات یا وجود مکمل طور پر خلا ہے مگر یہ خلا خالی نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔'' (النور: ۳۵)

باریک بینی سے تفکر کیا جائے تو راز کھلتا ہے کہ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، سب ڈائیاں ہیں جن پر اللہ کا نور محیط ہے۔ یہاں خالی نظر آنے والی جگہ خالی نہیں— وہاں موجود تخلیقات ہماری نظر سے اوجھل ہیں اور ہم اپنی لاعلمی کو خالی جگہ کا نام دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل کود ہے اور ایک زینت، اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش ہوگئی تو پیدا ہونے والی نباتات کاشت کار کو بھلی لگی پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بن جاتی ہے۔ اور آخرت میں سخت عذاب ہے، اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوش نودی بھی ہے۔ دنیا کی زندگی تو متاعِ فریب کے سوا کچھ نہیں۔'' (الحدید: ۲۰)

دنیا میں زندگی مختلف اجسام اور کیفیات کا مجموعہ ہے۔ یہ سارے اجسام فریب ہیں کیوں کہ یہ ٹھوس نظر آتے ہیں جب کہ یہ ذرّات کا مجموعہ ہیں۔ ان کی اصل نور ہے اور نور انتہائی لطیف ہے۔

آدمی بجنی مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ بجنی مٹی خلا

ہے۔مٹی کے جسم کی ابتدا ذرّے سے ہے۔تحقیق و تلاش نے ذرّے کو ایٹم کا نام دیا ہے جو انتہائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے مادی آنکھ سے نظر نہیں آتا۔انتہائی چھوٹا ایٹم، دوسرے ایٹموں کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اجسام بناتا ہے، اس طرح جسم کی اسپیس پر مادی آنکھ سے نظر نہ آنے والے اربوں کھربوں ذرّات کا غلبہ ہے جو اولی الالباب ہستیوں کی راہ نمائی کرتا ہے کہ نظر آنے والے چھوٹے بڑے اجسام نظر کا دھوکا ہیں کیوں کہ یہ نظر نہ آنے والے انتہائی چھوٹے ذرّات کا مجموعہ ہیں۔قصہ مختصر جس چیز کو ہم بڑا دیکھ رہے ہیں، وہ بڑی نہیں۔

''تم قیاس کی نظر سے گمان کرتے ہو کہ پہاڑ جمے ہوئے ہیں۔یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔''

(النمل: ۸۸)

مجسم وجود ــــ چھوٹا ہو یا بڑا ــــ اس کا ٹھوس پن فریبِ نظر ہے کیوں کہ وجود کا مختلف صورتوں میں نظر آنا مخصوص تعداد میں ذرّات کی یکجائی ہے۔

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ فرماتے ہیں:

''جو چیز جتنی ٹھوس ہوگی اسی مناسبت سے اس میں خلا ہوگا۔روحانی آنکھ سے اگر دیوار کو دیکھا جائے تو ہر اینٹ کے اندر بڑے بڑے سوراخ نظر آتے ہیں۔پہاڑوں کو اگر باطنی آنکھ سے دیکھا جائے تو بڑے بڑے غار نظر آتے ہیں۔لگتا ہے بادلوں کی طرح کوئی چیز آسمان میں تیر رہی ہے۔خلاؤں کو پُر کرنے کے لئے ان حواس میں ایسے تقاضے بھی موجود ہیں جن کو ہم اختیاری حواس کہہ سکتے ہیں یعنی ایسے حواس جو ہمیں زندگی کے تعمیری رخ پر قائم رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ان خلاؤں میں جو رخ تعمیر کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کا نام ضمیر ہے۔''

تحقیق کے مطابق بالغ فرد تقریباً سات ارب ارب ارب ایٹموں (7×10^{27}) کا مجموعہ ہے۔ یعنی سات کے آگے 27 مرتبہ صفر لگا دیں۔

اگرچہ یہ تعداد اندازے پر قائم ہے مگر حقیقت کی تلاش اور اندر میں موجود ذوق کے تحت میں اس کو نظر انداز نہیں کر سکی۔جسم میں ایٹم کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے مگر یہ بات مسلّمہ ہے کہ ہر وجود ذرّات کا مرکب ہے۔

میں نے ارادہ کیا کہ جو شے جسم میں اکثریت میں ہے اور ہمارا تعارف بن رہی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کروں کہ ایٹم کیا ہے اور محقق اسے 99 فی صد سے زیادہ خالی کیوں کہتے ہیں۔

محققین کے مطابق ہر ایٹم کا ایک فی صد سے بھی کم حصہ پروٹان، نیوٹران اور الیکٹران پر مشتمل ہے، بقیہ جگہ خالی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ انسانی جسم کی خالی

اسپیس ختم کردی جائے تو پورا جسم بمشکل ریت کے ایک ذرّے سے بھی کم اسپیس رکھتا ہے۔ اس طرح آپ زمین پر موجود سات ارب سے زائد آدم زاد کی اسپیس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایٹم کے اندر، ایٹم سے چھوٹی ایک دنیا ہے جسے نیوکلیس یا مرکزہ کہتے ہیں۔ مرکزہ کے گرد الیکٹران مسلسل گردش کرتے ہیں۔

محققین کا اندازہ ہے کہ نیوکلیس ایٹم سے ایک لاکھ گنا چھوٹا ہے۔ جیسے مثال مونگ پھلی کا دانہ جسے کرکٹ اسٹیڈیم کے بیچ میں رکھ دیا جائے۔

سوال: ایٹم کے اندر موجود اتنے بڑے خلا کو کس شے نے جوڑ رکھا ہے ــــ؟

جواب تک پہنچنے کے لئے میں نے پہلے الیکٹران کو سمجھا جو سائنس کے مطابق ایٹم میں خلا قائم رکھنے میں اہم کردار کرتا ہے۔

محقق اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ ایٹم میں موجود خالی جگہ بھی خالی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ الیکٹران کے گردش میں رہنے سے خلا میں نظر نہ آنے والی لہریں اور کوانٹم فیلڈز پیدا ہوتی ہیں۔

پنکھا ساکن ہوتا ہے تو ہاتھ بلیڈز کے درمیان خالی جگہ میں سے گزر جاتا ہے۔ یہی پنکھا حرکت میں ہو تو بلیڈز کے درمیان خلا نظر نہیں آتا، نہ اسے چھوا جا سکتا ہے کیوں کہ بلیڈز خلا کو تیزی سے پُر کر رہے ہیں۔

الیکٹران آزاد حرکت کرتے ہیں۔ حرکت اتنی تیز ہوتی ہے کہ بتایا نہیں جا سکتا کون سا الیکٹران کس وقت کس مقام پر ہے۔ تیز رفتار حرکت سے بننے والی لہریں ایٹم میں خالی اسپیس بھرنے کا تاثر دیتی ہیں۔

پنکھے کے بلیڈز کو الیکٹران تصور کر کے سمجھنا آسان ہے کہ ایٹم کے گرد الیکٹران کی حرکت سے پیدا ہونے والی لہریں، خالی اسپیس میں ایسا الوژن بناتی ہیں کہ خلا کے ٹھوس ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

پنکھے کی مثال پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی اسپیس حرکت کے سبب ٹھوس نظر آتی ہے اور حرکت کی الگ الگ مقداروں سے ٹھوس پن مختلف شکل و صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اربوں ایٹموں سے تشکیل شدہ ہمارا جسم الیکٹران کی حرکت کی وجہ سے جس مقام پر نظر آتا ہے، وہاں نہیں ہے، مسلسل غیب ظاہر ــــ ظاہر غیب بن رہا ہے۔

ماہرِ طبیعیات ارنسٹ ردرفورڈ لیبارٹری میں تجربے میں مشغول تھا۔ اس نے الفا شعاعوں کی دھار سونے کے ورق میں سے گزاری۔ بیش تر ذرّات گزر گئے اور چند ٹکرا کر پلٹ گئے۔

ذرّات کا پلٹنا اس کے لئے معمّا تھا۔ جاننے کے لئے مزید تحقیق کی اور نظریہ پیش کیا کہ ایٹم کا بیش تر

حصہ خالی ہے اس لئے زیادہ تر الفاذرّات سونے کے ورق میں سے گزر گئے اور جو واپس ہوئے وہ ایٹم کے ٹھوس حصے یعنی نیوکلیس سے ٹکرائے تھے۔

تحقیق اندازے پر قائم ہے کیوں کہ یہ جواب نہیں دیتی کہ جب ایٹم خالی ہے تو مرکزہ ٹھوس کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا خلا میں شے کے ٹھوس نظر آنے کا نظریہ مرکزہ پر صادق نہیں آسکتا اور کیا ثبوت ہے کہ الفا شعاعیں جس شے سے ٹکرا کر واپس ہوئیں، وہ مرکزہ تھا؟ مرکزہ کو براہِ راست یا بلاواسطہ مشاہدے سے ابھی تک نہیں دیکھا گیا لہٰذا اس کے ٹھوس پن اور ترکیب سے متعلق نظریات مفروضات ہیں۔

ایٹم اور اس سے بنی ہر چیز خول ہے۔ کہنا بجا ہے کہ خول نما ہمارا جسم، خول نما سیارے پر موجود ہے اور ایسی کائنات کا حصہ ہے جو خود ایک خول ہے۔ خول میں لہروں کی حرکت سے چیزوں کے ٹھوس ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ایک محقق کا کہنا ہے:

''صرف ایٹموں میں موجود خالی اسپیس پر تحقیق کی جائے تو کئی رازوں سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ اس کے ذریعے کائنات کے خفیہ گوشے ظاہر ہونے سے طبیعیات کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔''

طبیعیات کے شعبے میں نوبل انعام یافتہ محقق میکس پلانک نے اعتراف کیا ہے کہ

''میں — بطور محقق جس نے اپنی زندگی مادے (matter) پر تحقیق میں صرف کردی، ایٹموں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ مادے کا وجود حقیقی نہیں۔ جس کو ہم مادہ سمجھتے ہیں وہ ایک قوت سے پیدا ہوتا اور قائم رہتا ہے۔ اس قوت سے ایٹم کے اجزا میں ارتعاش ظاہر ہوتا ہے اور یہی قوت ایٹم کو مجتمع رکھتی ہے۔ اس قوت کے پیچھے یقیناً کوئی ذہین اور باشعور ہستی ہے۔''

حقیقت سے واقف ہونے کے لئے محقق کے پاس اس امر کو تسلیم کرنے کے سوا راستہ نہیں کہ مادہ نظر کا دھوکا ہے۔ کوئی طاقت ہے جو مادے میں حرکت ظاہر کرتی ہے۔

سماوات، جمادات، نباتات، حیوانات، جنات، آدمی اور زمین — ٹھوس نظر آتے ہیں۔ یہ لہروں سے بنے ہیں۔ لہر — لہر میں سے گزر جاتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایٹم کی طرح میں خول ہوں اور دیوار بھی خول ہے۔ ہم دونوں کے اندر اسپیس جس شے سے بھری گئی ہے، میں اسے نہیں دیکھ رہی۔ ہم دونوں لہر ہیں پھر میرے اندر دیوار یا دیگر چیزوں میں سے گزرنے کی صلاحیت کیوں نہیں — ؟ وجہ یہ ہے کہ الیکٹران کی حرکت شے کے گرد برقی مقناطیسی میدان بناتی ہے جس سے اشیا ٹھوس محسوس ہوتی ہیں

اور ٹھوس پن کا احساس نظر بن جاتا ہے۔

جسم میں نیگیٹو چارج کے حامل الیکٹران اور پازیٹو چارج کے حامل پروٹان کی تعداد برابر ہے۔ دیوار (جسم) میں بھی ایسا ہے۔ فرد اور دیوار میں موجود الیکٹران کی میگنیٹک فیلڈ ایک دوسرے کو دھکیلتی ہیں یعنی گریز کرتی ہیں، اس دوران پروٹان میں کشش انہیں قریب لاتی ہے۔ فرد جب تک دیوار سے نہ ٹکرائے، کشش و گریز محسوس نہیں کرتا۔ دیوار میں سے گزرنے کی کوشش میں دونوں کی الیکٹران کی میگنیٹک فیلڈ متصادم ہوتی ہیں اور ایک کو دوسرے میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔

جب فرد اور دیوار میں موجود پروٹان ایک دوسرے میں کشش محسوس کرتے ہیں پھر کشش غالب کیوں نہیں ہوتی، گریز کیوں غالب ہوتا ہے—؟ شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدینؒ دیوار میں سے گزر گئے۔ وہاں گریز مغلوب اور کشش کس قانون کے تحت غالب ہوئی—؟

حاصل تحریر: جس طاقت کی وجہ سے ہم چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ دیکھتے ہیں، اسی طاقت کی وجہ سے اپنے آپ کو ٹھوس سمجھتے ہیں جب کہ ہم لہروں سے بنے ہیں۔ لہروں میں کشش اور گریز سے ٹھوس پن کا گمان ہوتا ہے۔ مرشد کریم فرماتے ہیں،

> لڑکے نے ماں سے پوچھا کہ فہم و فراست کی نشانی کیا ہے—؟ ماں نے کہا، اگر تم زندگی میں ہر بات کے لئے دوسروں کو الزام دیتے ہو تو فہم و فراست کی منزل تم سے بہت دور ہے، خود کو الزام دیتے ہو تو آدھا راستہ طے کر لیا ہے اور کسی کو الزام نہیں دیتے تو سمجھ لو کہ تم منزل پر پہنچ چکے ہو۔

''جب تک فرد جو کچھ دیکھ رہا ہے، اس میں گم ہے، وہ نہیں دیکھتا۔''

بات گہری ہے۔ اس میں فریبِ نظر سے نکلنے کی ایکویشن (مساوات) ہے۔

خلا میں برسرِ عمل نظام کا روحانی قانون درج ذیل ہے جو پورے مضمون کا خلاصہ ہے۔

''آدم بجتی مٹی (خلا) ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے روح پھونکی گئی۔ جب روح پھونکی تو روح کو علمِ اشیا عطا ہوا۔ علمِ اشیا عطا ہونے کے بعد آدم کو زندگی گزارنے اور تکوینِ کائنات سے متعلق جو علوم حاصل ہوئے، ان علوم سے قوانین فطرت کو تلاش کرنا عالمِ فطرت ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ خلا سے نکل کر روح میں داخل ہو اور اس روح کی معرفت علمِ اشیا حاصل کرے اور علمِ اشیا حاصل کرنے کے بعد غیب کا کھوج لگائے۔''

(کتاب: نظریۂ رنگ و نور)

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحب کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی

نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

عابد محمود

کہن، سنن، کرن

عاشقِ رسولؐ ــــ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

ماسٹر صاحب فقیر محمد کلاس کے دروازے پر کھڑے طالب علموں کو بحث کرتا دیکھ رہے تھے۔ طالب علم ان کی آمد سے بے خبر دلائل دے کر ایک دوسرے کو قائل کرنے میں مصروف تھے۔ ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو کر ادب میں کھڑے ہو گئے۔

ماسٹر صاحب نے تختۂ سیاہ کے پاس پہنچ کر ایک نظر کلاس پر ڈالی اور حاضری لینے کے بعد سبق شروع کیا،

''قرآن کریم الہامی کتابوں میں آخری کتاب ہے جو اللہ عزّ وجل نے اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ پر نازل فرمائی۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کریم لفظ بہ لفظ محفوظ ہے۔ یہ کتاب راہ نمائی کرتی ہے کہ مخلوق ایک راہ پر چل کر تفرقے سے بچے اور اللہ کا قرب حاصل کرے۔ یہ کتاب جس میں شک نہیں، سنہری اصولوں پر زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔''

ماسٹر صاحب نے چاک اٹھا کر تختۂ سیاہ پر لکھنا شروع کیا اور طالب علموں نے کاپیاں کھول لیں۔

کلاس میں چند سیکنڈ کے لئے کاغذ پلٹنے کا شور ہوا۔

بچو! آج کا سبق ہے، مضامینِ قرآن کی تعریف۔

سبق دینے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

طالب علم سبق کاپی میں نقل کر رہے تھے۔

شہر کرن سے تعلق رکھنے والا ایک طالب علم جس کا نام سالک تھا، تختۂ سیاہ پر الفاظ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کاپی بند تھی۔ ماسٹر صاحب نے سمجھا کہ وہ سبق لکھ چکا ہے۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے طلبا سے کہا، کل سب نے سورہ فاتحہ یاد کی تھی، فرداً فرداً کھڑے ہو اور سناؤ۔ عاطف! تمہیں یاد ہے؟

جی ماسٹر جی! یاد ہے۔ عاطف نے تعوذ اور تسمیہ پڑھنے کے بعد قرأت کے ساتھ سورہ فاتحہ سنائی۔

ماسٹر صاحب نے نظیر سے کہا، تم ترجمہ سناؤ۔

نظیر خوشی خوشی کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پڑھا:

اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود سے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ سنانے لگا۔

ماسٹر صاحب نے نظیر کو شاباش دی اور یوسف سے مخاطب ہوئے ، بیٹا! اعوذ کا مادہ (root word) بتاؤ اور اس کی تشریح کرو۔

یوسف کھڑا ہوا اور بتایا، ماسٹر صاحب ! اعوذ کے بنیادی حروف 'ع و ذ' ہیں۔ کسی کی پناہ میں آنے اور اس سے قوت لینے کے معنی میں آتا ہے۔ اعوذ کے معانی ہیں کہ کسی کی پناہ میں آنا، اس کی حفاظت میں محفوظ ہو جانا، کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا یعنی اسے لازم پکڑ لینا، مستقل طور پر اختیار کرنا۔

ماسٹر صاحب نے ستائشی نظروں سے طالب علم کو دیکھا۔ اس طرح سب نے فرداً فرداً سبق دہرایا۔

ماسٹر صاحب فقیر محمد شہر سے باہر قائم معروف مکتب میں 30 سال سے پڑھا رہے تھے۔ والدین کی خواہش تھی کہ بچے ان کے مکتب میں پڑھیں۔

ویرانے میں موجود درس گاہ کے اردگرد تین شہر آباد تھے۔ سنن، کہن اور کرن۔ کہن اور سنن آبادی کے لحاظ سے بڑے شہر تھے۔ جب کہ کرن رقبے اور آبادی کے لحاظ سے چھوٹا شہر تھا۔ مکتب میں بچوں کا تعلق شہر کہن اور سنن سے تھا۔ ایک بچہ شہر کرن سے تھا اور دو روز پہلے مکتب میں داخل ہوا تھا۔

پوری کلاس سے سبق سننے کے بعد شہر کرن کے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماسٹر صاحب نے کہا، بیٹا سالک! اب تمہاری باری ہے۔

سالک جھجکتے ہوئے کھڑا ہوا مگر خاموش رہا۔

ماسٹر صاحب سمجھ گئے کہ سالک نے سبق یاد نہیں کیا۔ سخت لہجے میں پوچھا، کیا تمہیں سبق یاد نہیں؟

شرمندگی سے کہا، میں سبق یاد نہیں کر سکا۔

ماسٹر صاحب نے اضطراب میں پہلو بدلا اور سالک کو ڈانٹتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ ان کے مکتب میں کسی نے سبق یاد نہ کیا ہو۔

ماسٹر صاحب کی قرأت ماحول سے بے نیاز کر دیتی ہے، جی چاہتا ہے سنتا رہوں۔ محلّہ کے قاری صاحب کی قرأت مجھے بہت پسند تھی۔ جب معلوم ہوا کہ ان کے استاد فقیر محمد ہیں تو میں نے مکتب میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ شہر سنن کے رہائشی حارث نے ماسٹر صاحب کی تعریف کرتے ہوئے عاطف کو بتایا۔

جواب میں عاطف نے روداد سنائی کہ ہمارے شہر کہن میں ہر شام کو مجلس ہوتی ہے جس میں ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھا جاتا ہے پھر سب معنی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے اندر بھی خواہش پیدا ہوئی۔ کسی نے ماسٹر صاحب کے مکتب میں داخل ہونے کا مشورہ دیا اور میں یہاں آ گیا۔

سالک خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے، تم یہاں کیا کرنے آئے

ہو؟ کلاس ایک ماہ کا کورس مکمل کر چکی ہے اور تم ابھی تک پہلے سبق پر ہو۔ روز ماسٹر جی سے ڈانٹ کھاتے ہو۔ ہم حیران ہیں کہ انہوں نے تمہیں اب تک مکتب میں کیوں رکھا ہے۔

سالک نے ساتھیوں سے کہا، حیرت ہے آپ سب اتنا مشکل سبق ایک دن میں یاد کر لیتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن ــــ! بات سن کر سب ہنسنے لگے۔ کسی نے کہا، پہلی سورہ تم سے حفظ نہیں ہو رہی، پورا قرآن کیسے حفظ کرو گے؟

سالک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دادا نے مکتب میں داخلے کے وقت کہا تھا، پتر! قرآن کریم رہتی دنیا تک راہ نما کتاب ہے۔ سب اپنے ذہن کی وسعت کے مطابق اسے سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب باطن در باطن مفہوم رکھتی ہے ــــ علم کی کوئی حد نہیں۔ جتنا پڑھو گے، نئے معنی و مفہوم منکشف ہوں گے۔ عربی گرامر آ جائے تو بہت اچھی بات ہے۔ پیغام کو اس کی اصل زبان میں سمجھنا چاہئے۔ بس کوشش کرنا کہ مقصد قران کے باطن کو سمجھنا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب تم آیت کو اللہ کا حکم سمجھ کر اس پر عمل کرو گے۔

حضرت شمس تبریزیؒ فرماتے ہیں،

'' قرآن پڑھنے والا ہر شخص، قرآن کو اپنے فہم و ادراک کی گہرائی کے مطابق سمجھتا ہے۔ قرآن کی فہم کے چار درجات ہیں۔ پہلا درجہ ظاہری معانی ہیں، اکثریت اسی پر قناعت کرتی ہے۔ دوسرا درجہ باطنی معانی کا ہے۔ تیسرا درجہ باطنی معانی کا بطن ہے۔ اور چوتھا درجہ اس قدر عمیق معنوں کا حامل ہے کہ زبان ان کے بیان پر قادر نہیں۔''

ماسٹر صاحب نے سالک کو اپنے کمرے میں بلایا۔ بیٹا! مجھے افسوس سے کہنا پڑھ رہا ہے کہ تم اس مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ شہر کرن سے تم پہلے طالب علم ہو۔ میں خوش تھا کہ تمہارے علاقے سے کوئی ہمارے مکتب میں آیا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ شہر کرن کے لوگ اس قدر کند ذہن اور لاپرواہیں۔

سالک بولا، ماسٹر جی! سخت شرمندہ ہوں کہ سبق یاد نہیں کر سکا۔ دن رات کوشش کرتا ہوں۔

انہوں نے کہا، سورہ فاتحہ تمہیں یاد نہیں ہو رہی۔ پورا قرآن کیسے پڑھو گے؟ ایک ماہ گزر گیا ہے۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ کل تک سبق یاد کر لو ورنہ مکتب کی نشست کسی قابل لڑکے کے لئے خالی کر دو۔ محدود نشستوں کی وجہ سے سب کو داخلہ نہیں ملتا۔ داخلے کے امتحان میں تم نے اچھے نمبر لئے تھے پتہ نہیں اب کیا ہو گیا ہے۔

سالک نے آہستہ آواز میں کہا، میں کل تک سبق یاد نہیں کر سکتا۔ ماسٹر صاحب کو غصہ آ گیا۔ اونچی آواز میں بولے، ٹھیک ہے۔ تم گھر واپس جا سکتے ہو۔

سالک بوجھل قدموں سے اٹھا مگر دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ پلٹ کر ماسٹر صاحب کے قریب آیا اور پوچھا، ماسٹر جی! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سبق یاد کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ شاگرد کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر انہوں نے نرمی سے جواب دیا، پتر! خوب محنت کرو، بار بار دہراؤ، ایک ایک لفظ توجہ سے پڑھو۔ جتنا دہراؤ گے، سبق ازبر ہو جائے گا۔

ماسٹر جی! کیا ازبر ہونے سے سبق یاد ہو جاتا ہے؟

پتر! ازبر ہونا اور یاد ہونا ایک بات ہے۔

سالک نے تعوذ، تسمیہ اور سورہ فاتحہ پڑھی اور ترجمہ بھی سنایا۔ الفاظ کے معنی و مفہوم اور بنیادی حروف کی تفصیل بتائی۔ ماسٹر صاحب نے حیرت سے دیکھا۔ بیٹا! جب سبق یاد ہے پھر سنایا کیوں نہیں؟ پوری کلاس سورہ بقرہ کا پہلا رکوع پڑھ چکی ہے۔

ماسٹر جی! سبق یاد نہیں ہو رہا۔ کیا زبانی پڑھنا، سبق یاد ہونا ہے ــــ؟

ماسٹر صاحب سکتہ میں آ گئے۔

ماسٹر جی! الفاظ یاد ہو گئے ہیں۔ میں اب کسی بھی محفل میں علمی باتیں کر سکتا ہوں لیکن جو کچھ یاد کیا ہے اس کا حق کیسے ادا ہوگا؟ میرا مالک اللہ چاہتا ہے کہ میں اس کی پناہ میں آ جاؤں جب کہ میں تو ہمہ وقت وسوسوں اور اپنی انا میں قید ہوں۔ میرا خالق چاہتا ہے کہ میں مشاہدہ کر لوں کہ اللہ رحمٰن اور رحیم ہے لیکن میں روز بھول جاتا ہوں کہ کتنی بڑی ہستی کی پناہ میں ہوں۔ آپ نے پڑھایا تھا کہ تعوذ کے بنیادی حروف 'ع وذ' ہیں جس کا مطلب ہے کسی کی حفاظت میں آنا اور اس حفاظت کو مستقل طور پر اختیار کرنا۔ اپنے رب کے لئے میرے اندر ایسا یقین کیوں راسخ نہیں؟ الفاظ یاد کر لئے ہیں ماسٹر جی! لیکن باطن سے دور ہوں۔ جو کچھ پڑھ رہا ہوں، جب تک مشاہدہ نہیں ہو جاتا، میں نہیں سمجھتا کہ میں نے یاد کرنے کا حق ادا کر لیا۔ میرے اندر ڈر اور خوف اشارہ ہے کہ میں یاد کرنے کے باوجود سبق یاد نہیں کر سکا ــــ اعوذ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یقین راسخ نہ ہو تو کیسے کہہ دوں کہ مجھے سبق یاد ہو گیا ہے۔

ماسٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ وہ سالک کی فکر میں گہرائی سمجھ گئے۔ انہوں نے جان لیا کہ شہر کہن کے لوگ بس کہتے ہیں، سننے والے سنتے ہیں مگر شہر کرن کے لوگ اتنا ہی کہتے ہیں جتنا وہ عمل کرتے ہیں۔

ماسٹر جی! مجھے اجازت دیں، میں اچھا طالب علم نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ ماسٹر صاحب سکتہ کی کیفیت میں دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

خواتین و حضرات! بتائیے اس مہینہ کا سب سے بہتر سبق آموز مضمون کون سا ہے ــــ؟

خواجہ شمس الدین عظیمی

مسائل کا حل

پیراسائیکالوجی کے تحت دیئے گئے علاج کے لئے اجازت ضروری ہے۔کوئی صاحب یا صاحبہ اجازت کے بغیر علاج نہ کریں۔ (ادارہ)

سکون محسوس ہوتا ہے

نام شائع نہ کریں (کراچی): اپریل 2020ء کے شمارہ میں میرے خط کا جواب شائع کیا گیا۔جو مشق دی گئی میں نے اس پر پابندی سے عمل کیا۔ اب حالات یہ ہیں کہ مجھے اپنے اندر تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ پہلے میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھی۔ اب سکون محسوس ہوتا ہے۔ٹینشن کم ہوگئی ہے۔ میرے لئے آگے کیا حکم ہے۔

جواب: عمل جاری رکھیں۔انشاءاللہ مقصد میں کامیابی ہوگی۔

فزیوتھراپی

آمنہ (امریکا): جسم کے بائیں حصے کی حرکت آہستہ ہوگئی ہے۔ چلنے میں بہت دشواری ہے۔ہاتھ میں کپکپاہٹ رہتی ہے۔ دماغ کی ہڈیاں سکڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔خصوصاً دائیں طرف سر کے پچھلے حصے کی۔کسی وقت زبان بھی لڑکھڑاتی ہے اور سر میں جھٹکے لگتے ہیں۔سارے ٹیسٹ صحیح ہیں۔ بلڈ پریشر نارمل ہے، شوگر نہیں ہے، کولیسٹرول اور یورک ایسڈ معمولی بڑھا ہوا ہے۔ایلوپیتھی اور حکیمی علاج جاری ہے۔ وقتی فائدہ ہوتا ہے پھر وہی کیفیت ہوجاتی ہے۔عبادت کے دوران کسی وقت بدبو کے بھبکے محسوس ہوتے ہیں اور ہر وقت زینے سے گرنے کا خوف رہتا ہے۔

جواب: ایک مہینے تک نمکین اشیا سے مکمل پرہیز کریں۔میٹھی یا پھیکی چیزیں کھائیں۔رات کو سونے سے پہلے ایسی جگہ بیٹھ جائیں جہاں سے کھلا آسمان نظر آئے۔10 سے 15 منٹ آسمان کو دیکھتی رہیں اور تصور کریں کہ ستاروں کی چمک دمک آپ کے اندر منتقل ہورہی ہے۔عمل کرکے بات کئے بغیر سو جائیں۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو سوچیں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔آپ کے لئے فزیوتھراپی بہت مفید ہے۔

ایک چپ سو کو ہرائے

فائزہ (کراچی): شادی کو دو سال ہونے والے ہیں۔ بیٹی پیدائش کے دوران انتقال کر گئی۔ شادی کے کچھ عرصے تک سسرال والے ٹھیک تھے۔ بیٹی کے انتقال کے بعد رویہ بدل گیا۔ اب میں شوہر کے ساتھ اپنی امی کے گھر پر ہوں۔ شوہر اور میری بہت لڑائی ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی امی اور بہن سے مل کر آتے ہیں تو مجھ سے بہت لڑتے ہیں اور رشتہ ختم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ میں پہلے ایسی نہیں تھی۔ بیٹی کے انتقال کے بعد سے مزاج میں تبدیلی آئی ہے۔ چاہتی ہوں کہ ہمارا غصہ ختم ہو اور ایک دوسرے کی عزت کریں۔ بیٹی کے انتقال کو دس مہینے ہو گئے ہیں، دوبارہ حمل نہیں ٹھہرا۔ رسولی بھی ہو گئی تھی۔ تھائی رائیڈ کی وجہ سے وزن تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا کیا کروں کہ شوہر سے تعلقات اچھے ہو جائیں اور اولاد کی نعمت عطا ہو۔

جواب: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ غصہ نہیں کرتے (غصہ کھا جاتے ہیں) اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اللہ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا دوسرا رخ کیا ہے، اس بارے میں رات کو سونے سے پہلے سوچئے اور سو جایئے۔

جب تک ذہن حقیقت اور الوژن سے واقف نہ ہو اور ایک مرکزی نقطے پر یکسو نہ ہو تو کیفیات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ دو میں سے اگر ایک یہ فیصلہ کرے کہ غصہ نہیں کرنا، ہر ناگوار بات پر صبر کرنا ہے تو معاملات آسان ہو جاتے ہیں۔ جب غصہ آئے، تین دفعہ 'اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے' پڑھ کر آسمان کی طرف دیکھیں۔ انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ مذاق بھی پڑھئے

م۔ ع (لاہور): ایسا عمل بتائیں کہ میں سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخن تک خوب صورتی، کشش اور جاذبیت کا شاہکار بن جاؤں اور یہ سب عمر بھر قائم رہے۔ آنکھوں کے نیچے جھریاں پڑ رہی ہیں۔ شادی کو 12 سال ہو گئے ہیں۔ شادی سے پہلے چند عادات کے سبب قوتِ ارادی اور خود اعتمادی متاثر ہوئی۔ معمولی پریشانی ذہن پر سوار ہو جاتی ہے۔ بھوک لگتی ہے نہ نیند آتی ہے۔ بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ بہادر بننا چاہتا ہوں۔ گزارش ہے کہ مسائل کے حل میں میری مدد کریں۔

جواب: میرے خیال میں آپ خواہشات کا ایک سمندر ہیں جس میں طرح طرح کی مخلوقات ہیں۔ سمندر کا وصف یہ ہے کہ بے شمار الوژن کے باوجود سمندر یکسوئی کے ساتھ سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

آپ کا علاج یہ ہے کہ آپ سمندر کی صفات کو اختیار کر کے اپنے اندر سمندر کی گہرائی تلاش کریں۔ آپ کا خط نہایت پُر مذاق اور اغراض سے پُر ہے۔ بھائی ہم فقیر لوگ ہیں، ہمیں اپنی قابلیت پر کوئی گھمنڈ نہیں۔ فقیر کوشش کرتا ہے کہ جس طرح بھی ہو اللہ کی مخلوق کی خدمت کی جائے۔ سب سے پسندیدہ عمل خدمت خلق ہے۔ جسمانی خوب صورتی بھول بھلیاں ہیں، ان کو اصلی نہ سمجھیں۔ کوئل بچہ سب کو اچھا لگتا ہے وہ آدمی ہو یا جانور یا درخت، اس کا جوبن خود اس کو گردن اٹھانے پر مجبور کرتا ہے، ہوا چلتی ہے اور اندر کی خوشی ظاہر کرنے کے لئے ہوا کے دوش پر رقص کرتا ہے، جھکتا ہے، سیدھا ہوتا ہے یعنی اپنی جسمانی خوب صورتی کا مختلف انداز میں مظاہرہ کرتا ہے لیکن سوچنا یہ ہے کہ انجام کیا ہے۔

صفحہ نمبر 86

محمد اعظم (سیالکوٹ): بیٹا آٹھ سال سے کمر کے مہروں اور ہڈیوں کے مخصوص مرض میں مبتلا ہے جس میں مدافعتی نظام الٹا چلتا ہے۔ ہر طرح کا علاج کروایا لیکن عارضی افاقہ ہوتا ہے۔ ایم آر آئی کی تشخیص کے مطابق نچلے چار مہروں میں مسئلہ ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں لیکن صورت حال نہایت پریشان کن ہے۔ سنجیدہ مسائل میں گھر چکا ہوں۔ مایوس ہو کر ادویات چھوڑ دی ہیں۔

جواب: کتاب 'روحانی علاج' صفحہ نمبر 86 میں 'گدی اور کمر میں درد' کے عنوان سے علاج لکھا ہوا ہے جو کمر اور مہروں سے متعلق ہے۔

پیرا سائیکالوجی
(Parapsychology)

اماں کا نام: ..... سائل کا نام: .....

تاریخ اور وقت پیدائش: ..... تعلیم: ..... ازدواجی حیثیت: .....

جاگنے کا دورانیہ: ..... سانس کا دورانیہ کتنے سیکنڈ ہے: .....

کھانا پیٹ بھر کے کھاتے ہیں یا بھوک رکھ کر: ..... نمک زیادہ پسند ہے یا مٹھاس: .....

خیالات میں حقیقت پسندی ہے یا الوژن: ..... دستخط: .....

خط و کتابت کا پتہ: .....

..... رابطہ نمبر: .....

عقل مند بیوی۔۔۔؟

نازیہ (م۔خ): شادی کو 10 سال ہوگئے ہیں، اولاد نہیں ہے۔ شوہر کی دوسری بیوی ہوں۔ بیوٹیشن اور سیلف میڈ ہوں۔ کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ زندگی بے وزن ڈول کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے گزر رہی ہے۔ جب ماں کے گھر رہنا مشکل ہو جاتا ہے تو رات کو پارلر میں گدّا بچھا کر سو جاتی ہوں۔ بھائی کماتے نہیں ہیں۔ شوہر ذمہ داری پوری نہیں کرتے، ساری توجہ پہلی بیوی کی طرف ہے۔ دو طرفہ ذمہ داریوں کے باعث میں اپنے لئے پلاٹ تک نہیں خرید سکی۔ جو بچت کی، وہ شوہر کا کام ختم ہونے پر انہیں کاروبار کے لئے دے دی۔ اب تہی دامن اور عدم تحفظ کا شکار ہوں۔ ایسا کیا کروں کہ شوہر اپنی ذمہ داری پوری کریں۔

جواب: شوہر کی ذمہ داری بیوی پوری نہ کرے۔ تکلیف ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ دوسرے گھر چلا جائے، جانے دیں۔ آپ نے شوہر کی عادت بگاڑ دی ہے اس لئے وہاں (پہلا گھر) بھی گزارا مشکل نظر آتا ہے۔ شوہر گھر آئے اور کھانے کا وقت ہو، پوچھ لیں۔ بات کرے تو آپ جواب میں ہاں ناں کے بعد کوئی بات نہ کریں۔ اگر ناراض ہو تو آپ مسکراتی رہیں۔ دوسرے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔ عمل 90 دن کرنا ہے۔ ''قربت سے احتراز کریں۔''

ایک مہینہ دس دن میں انشاءاللہ آپ کامیابی سے ہمکنار ہوں گی بشرطیکہ عمل یقین کے ساتھ پورا ہو۔

توازن کا قانون

ایک ماہر کرتب باز اپنے کم عمر شاگرد کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر روزانہ کرتب پیش کرتا تھا۔ کرتب یہ تھا کہ استاد سر پر لمبا بانس رکھ کر چلتا۔ شاگرد بھی توازن قائم رکھتے ہوئے بانس پر چڑھ کر اوپر بیٹھ جاتا۔ دونوں کو توازن رکھنے میں مہارت تھی اس لئے گرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ شاگرد کا خیال تھا کہ کرتب محنت طلب اور آمدنی کم ہے۔ استاد سے عرض کیا کہ اگر ہم اپنے کام میں تیزی لے آئیں اور اس کے لئے میں کرتب کے وقت آپ کو دیکھوں اور آپ مجھے دیکھیں تو ہم گرنے سے بچ سکتے ہیں اور زیادہ پیسے کما سکتے ہیں۔ استاد نے کہا، میرے بچے! اگر ایسا کیا تو اب تک جو سیکھا ہے، سب الٹ ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں توازن میں رہنا سکھا دیا ہے۔ ہم دونوں کے لئے بہتر ہے کہ خود پر نظر رکھیں۔ میں اپنے عمل کی اور تم اپنے عمل کی حفاظت کرو۔ یہی اصل توازن ہے۔ دوسروں پر نظر رکھنے سے توازن بگڑتا ہے۔ اپنی دیکھ بھال ہی دراصل ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے۔ اس طرح مجھے یقین ہے کہ ہم کسی بھی حادثے سے محفوظ رہیں گے اور اتنا کما لیں گے کہ ضرورت پوری ہوتی رہے۔

حامد ابراہیم

خلق کا خدمت گزار ہے پانی

پانی سادہ کیمیائی یا طبعی مرکب نظر آتا ہے لیکن غور طلب ہے کہ اتنے سادہ کیمیائی مرکب میں بے پناہ خصوصیات کیسے پیدا ہوئیں کہ وہ کرۂ ارض کے نظامِ حیات کو قائم رکھنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے ــــ؟

رب العالمین اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تخلیق کے رموز بیان کئے ہیں۔

''اور زمین میں الگ الگ خطے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کم تر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

(الرعد: ۴)

آیئے! تخلیقی فارمولا سمجھنے کی کوشش کریں۔

زمین میں الگ خطے: آیت میں 'زمین میں الگ الگ خطے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں' کے الفاظ میں زمین کی ساخت اور بناوٹ کا ہر حوالے سے احاطہ ہے۔ خطوں کے مفہوم میں زمین کے مرکز سے لے کر بیرونی سطح تک پیاز کے چھلکوں کی طرح متصل طبقات، زمین کے براعظمی قطعات اور مزید چھوٹے بڑے مختلف علاقے، ان کا زرخیزی اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہونا، سب شامل ہے۔

مختلف اجناس: زمین ٹکڑوں یعنی مقداروں میں تقسیم ہے۔ ان ٹکڑوں میں متفرق نباتات یا تاثیر کے پھل اور پودے پیدا ہوتے ہیں جن کی انواع اور ہر نوع میں اقسام آدمی کی شماریات سے زیادہ ہیں۔

ایک ہی پانی کے بے شمار خواص: قدرت ایک مٹی پر مشتمل قطعۂ زمین کو ایک پانی سے سیراب کرتی ہے اور اس پانی سے انواع و اقسام کے نباتات پیدا ہوتے ہیں۔ پانی کو متفرق مخلوقات کے سانچوں میں ڈھالنے اور نشوونما کا نظام و انتظام زمین میں ہے۔

آیت میں پانی کی عجیب ترین صلاحیت کا بیان ہے کہ یہ کسی بھی مخلوق میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں پانی میں کیمیائی تعامل کی صلاحیت

تمام معلوم اشیا سے زیادہ ہے۔

رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور ہم نے ہر جان دار شے پانی سے بنائی۔''

(الانبیآء:۳۰)

حیوانات، نباتات، حشرات، جمادات اور ساری مخلوقات پانی سے تخلیق ہیں۔ موجودہ تحقیق و تلاش تسلیم کرتی ہے کہ ہر جان دار کیمیائی مرکبات کی منفرد فیکٹری ہے۔ ہر پودے سے مختلف کیمیائی مادے پیدا ہوتے ہیں۔ فقط ایک ننھے پودے میں سینکڑوں اقسام کے کیمیائی مرکبات بنتے ہیں۔

آدمیوں اور جانوروں میں بھی یہی نظام ہے۔ معدہ، جگر، پتہ، لبلبہ، آنتیں، غدود حتیٰ کہ سارا جسم ہزاروں اقسام کے کیمیائی مرکبات پیدا کرنے کا کارخانہ ہے۔ قدرت کی صناعی دیکھئے کہ ہر نوع سے مختلف کیمیائی مادے پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں پانی کی صفات رائج علوم میں بیان کی گئی خصوصیات سے کہیں زیادہ ہیں اور ہم نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پانی ایسا کائناتی مظہر ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہر شے تخلیق فرمائی ہے۔

زمین تین حصے پانی اور ایک حصہ خشکی ہے۔ سورج کی تمازت سے سمندروں کی سطح پر پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ بلندی پر درجۂ حرارت میں کمی کی وجہ سے بخارات قدرے قریب آتے ہیں اور بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہوائیں بادلوں کو ہزاروں میل فاصلہ طے کر کے مختلف علاقوں میں لے جاتی ہیں۔ ہوا کے دباؤ اور درجۂ حرارت میں کمی کی بنا پر بخارات ضم ہو کر قطرے بنتے ہیں اور بارش برستی ہے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کم ہو جائے تو قطروں کے بجائے اولے برستے ہیں۔ بخارات سے بارش تک پانی کئی حالتوں میں تبدیل ہوتا ہے۔

سمندر میں لاشمار نمکیات و مرکبات حل ہیں۔ ان میں سوڈیم کلورائیڈ نسبتاً بڑی مقدار میں ہے۔ سورج سے آنے والے فوٹان پانی کی سطح سے ٹکراتے ہیں اور توانائی پانی میں منتقل کرتے ہیں۔ حرارت سے پانی کے سالمات (مالیکیولز) کی حرکت میں تیزی آتی ہے۔ نتیجے میں وہ تیز رفتار سالمات جن کا رخ اوپر کی جانب ہوتا ہے، پانی کی سطح پر موجود سالمات کی باہمی کشش (surface tension۔ سطحی تناؤ) توڑتے ہوئے ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔

وسائل کی تقسیم کا ہر مرحلہ دلچسپ ہے۔

سالمات پانی کی سطح سے باہر نکلنے سے پہلے مائع (پانی کی ایک حالت) ہیں۔ جیسے ہی سطح آب سے ہوا میں داخل ہوتے ہیں، گیس (بخارات) کہلاتے

ہیں۔جب کہ دونوں صورتوں میں یہ پانی ہیں۔ رفتاراور ماحول کے فرق سے ان کی شکل تبدیل ہوجاتی ہے۔

سمندری پانی کے سالمات میں نمک اور دیگر عناصر کے ذرّات ملے ہوئے ہیں لیکن جیسے ہی پانی کے سالمات بخارات میں تبدیل ہوتے ہیں (یعنی پانی سے ہوا میں داخل ہوتے ہیں) تو ان سالمات میں سے نمکیات وغیرہ کے ذرّات الگ ہوجاتے ہیں اور سالمات خالص حالت میں آجاتے ہیں۔البتہ ہوا میں موجود گیسیں بعدازاں معمولی مقدار میں پانی کے بخارات کے ساتھ کیمیائی تعامل کرتی ہیں جن سے مختلف تیزابی (کاربونک ایسڈ، نائٹرک ایسڈ وغیرہ) اور کھاد جیسی خصوصیات کی حامل رطوبات پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مرکب بارش میں شامل ہوکر بنجر زمین کے لئے حیاتِ نو کا وسیلہ بنتا ہے۔

اشارہ: مذکورہ عمل سے سمندر کے انتہائی کھارے اور نباتات کے لئے غیر موزوں پانی کی تاثیر تبدیل ہوتی ہے اور وہ میٹھا ہونے کے ساتھ زمین کے لئے وافر غذائیت کا حامل ہوتا ہے۔

سوال: پانی سادہ کیمیائی یا طبعی مرکب نظر آتا ہے لیکن غور طلب ہے کہ اتنے سادہ کیمیائی مرکب میں بے پناہ خصوصیات کیسے پیدا ہوئیں کہ وہ کرۂ ارض کے نظامِ حیات کو قائم رکھنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے ــــ؟

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ پانی دریاؤں، سمندروں، آبشاروں، چشموں، زیرزمین ذخائر کے علاوہ لاشمار مخلوقات کے اجسام کا حصہ اور حیات کا ذریعہ ہے۔ پانی ایک دائرہ مکمل کرکے دوبارہ زمین کے نظام میں داخل ہوکر نئے سرے سے اپنا عمل دہراتا ہے اور اس کی کیمیائی ترکیب جوں کی توں رہتی ہے۔

جس طرح دو یا تین گھنٹے کی فلم دیکھنے کے بعد ہم چند سیکنڈ یا منٹ میں فلم کا بآسانی جائزہ لے سکتے ہیں، اسی طرح ہزاروں سال کے دورانیے کا تصور کریں ــــ نظر آتا ہے کہ مخلوقات پانی پیتی ہیں اور استعمال کے باوجود ہزاروں سال سے پانی من و عن موجود ہے۔ پانی پینے سے بظاہر لگتا ہے کہ مخلوق عامل اور پانی معمول ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ پانی ہماری پیدائش سے پہلے موجود تھا اور بعد میں بھی موجود ہے، ہمارے پیدا ہونے یا مرنے سے پانی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو ہم تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ فرد معمول اور پانی عامل ہے ــــ ہم پانی نہیں پی رہے، پانی ہمیں پی رہا ہے۔

پانی کی اقسام: پانی طرح طرح کی مخلوقات میں

ڈھل جاتا ہے۔ یہ سب پانی کی اقسام ہیں۔ ان میں کیمیائی اعتبار سے پانی کا فارمولا اگرچہ وہی رہتا ہے لیکن مختلف مرکبات اور عناصر کی آمیزش سے لاتعداد اقسام کے solution (محلول) اور روغنیات وغیرہ تخلیق پاتے ہیں۔ چوں کہ ہر محلول منفرد خصوصیات کی بنا پر نام اور تشخص رکھتا ہے لہٰذا اسے مخصوص قسم کے پانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر شربت، پانی کا مشہور محلول ہے۔ پانی میں چینی، رنگ، خوش بو اور بعض اوقات گرم و سرد تاثیر کے لئے مخصوص عرق حل کیا جاتا ہے۔ اب اس کا نام رکھ دیں۔ نام دہرانے پر ہم ہمیشہ اسی محلول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

چائے، کافی، دودھ، خون، لعاب، تولیدی مائع، بارش کا پانی، جوہڑ کا پانی، دریا کا پانی، سمندر کا پانی اور کنوئیں کا پانی، پھلوں کے رس، تمام اقسام کے تیل حتیٰ کہ گوشت پوست کے اجسام جو بظاہر جمے ہوئے نظر آتے ہیں، سب پانی کی مختلف شکلیں ہیں۔

سوال: کیمیا کا طالب علم سوال کرسکتا ہے کہ تیل تو دافع آب خصوصیات رکھتا ہے پھر وہ پانی کی منقلب شکل کیسے ہوا؟

جواب: تجزیہ منکشف کرتا ہے کہ کسی بھی معدنی یا نباتاتی تیل کی تخلیق (سنتھیسز) دراصل پانی کے کاربن، ہائیڈروجن اور بعض اوقات آکسیجن اور نائٹروجن وغیرہ کے مرکبات سے کیمیائی طور پر یکجا ہونے سے عمل میں آتی ہے۔ تیل اور دوسری اقسام کی چکنائی اگرچہ کیمیائی طور پر پانی کے محلولات نہیں لیکن پانی کے بغیر ان کا وجود نہیں ہے۔ وہ تمام مائع جو پانی سے بظاہر مختلف کیمیائی فارمولا رکھتے ہیں، دراصل مختلف عناصر و مرکبات کے پانی میں کیمیائی طور پر حل ہونے سے وجود میں آئے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

۱۔ اور وہی ہے جس نے پانی سے پیدا کیا آدمی پھر اس کے رشتے اور سسرال مقرر کئے اور تمہارا رب ساری قدرت رکھتا ہے۔ (الفرقان:۵۴)

۲۔ اور انسان کو چاہئے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ پیدا کیا گیا اچھلتے ہوئے پانی سے۔ جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینے کے بیچ سے۔

(الطارق:۵۔۷)

۳۔ کیا وہ منی کا ایک نطفہ نہ تھا جو ٹپکایا جاتا ہے۔

(القیٰمۃ:۳۷)

آیات میں نوعِ آدم کو اپنی تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس مادے سے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ایسا پانی ہے کہ اس میں سڑاند ہے۔ رائج علوم میں اس مادے کو منی کا نام دیا گیا ہے۔

تجزیہ: منی (سیمین) کا کیمیائی تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ مختلف اجزا پر مشتمل ہے۔اس کے جزو اعظم، پانی میں پروٹین اور روغنیات (جو خود پانی سے تخلیق ہیں) کی مخصوص اقسام حل ہیں۔ پروٹین اور روغنیات کی پانی میں یکجائی کے لئے انزائم موجود ہیں۔ انزائم کی موجودگی کے دیگر مقاصد اس کے علاوہ ہیں۔شکر کے سالمات کی ایک مخصوص قسم فرکٹوز بھی اس محلول کا حصہ ہے۔

یہ پورا محلول نوعی بیج یعنی اسپرم میں حرکت اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

اسپرم کیا ہے—؟

مادی سائنس کی رو سے مخصوص خلیہ (cell) ہے جس میں جسم کے دوسرے خلیوں کی نسبت منفرد خصوصیات ہیں۔قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق اسپرم کا ممتاز ترین وصف حرکت ہے یعنی مخلوق کو پیدا کیا، اچھلتے ہوئے پانی سے۔

محقق نے انسانی اسپرم کا جو سائز معلوم کیا ہے وہ طول میں اندازاً پچاس سے ساٹھ مائیکرومیٹر* اور عرض میں پانچ مائیکرومیٹر ہے۔جب کہ اسپرم کے مدمقابل مونث تولیدی خلیہ یعنی بیضے کا سائز 130 مائیکرومیٹر سے 200 مائیکرومیٹر ہے۔یعنی بیضہ اسپرم (بیج) کے لئے زمین کا کردار ادا کرتا ہے۔

خلیے کی ساخت میں مزید خلوی رطوبات، مرکزہ، مرکزے کے اندر کروموسوم اور ڈی این اے، ڈی این اے میں نوعی و نسبی ریکارڈ کی حامل جینیاتی ترتیب وغیرہ ہیں۔لکھنے کا مقصد خلیات کی حیاتیاتی ساخت اور جزئیات بیان کرنا نہیں، یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم نے تولیدی مائع کو ایسے پانی سے موسوم کیا ہے جس میں حرکت (اچھلتا ہوا پانی) اور سڑاند ہے۔

تحقیق و تلاش جب منی، اسپرم، بیضہ، پروٹو پلازم اور سائٹو پلازم، مرکزہ، کروموسوم، ڈی این اے اور جتنی ساخت موجود ہیں، کا مطالعہ کرتی ہے تو نتیجے پر پہنچتی ہے کہ یہ سب پانی کی صورتیں ہیں۔

اشارہ: پانی میں تخلیق کے لیے درکار ساری مقداریں ہیں۔جس تخلیق کی ضرورت ہے، اس کی مقداریں پانی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

قارئین کرام! قرآن کریم کی تعلیمات تمام عالمین اور ادوار پر محیط ہیں۔الہامی کتاب میں پانی کے ذکر اور اوصاف پر تفکر سے سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح مادی وجود لباس اور روشنی کا وجود اصل ہے، اسی

* مائیکرومیٹر (میٹر کا دس لاکھواں حصہ)

طرح پانی کا بھی ظاہری اور باطنی وجود ہے۔

پانی کا اصل وجود روشنی سے بنا ہے۔ روشنی سے بنے پانی کے اصل وجود کا لباس کسی اور سیارے، حضیرے یا زون میں مختلف ہوسکتا ہے۔ چناں چہ ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ کسی شے کو اس کے لباس سے جاننے کی کوشش کرنا بالواسطہ طرز فکر ہے۔ بالواسطہ طرز فکر کے نتیجے میں کی جانے والی تحقیقات اصل تک پہنچانے کے بجائے بھول بھلیوں میں گم کرسکتی ہیں۔

بلا واسطہ طرز فکر یہ ہے کہ ہم شے کے لباس کو نظرانداز کر کے اصل کی طرف متوجہ ہوں اور غیر جانب دار ذہن سے تفکر کی کوشش کریں۔

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ فرماتے ہیں:

''نوعِ انسان میں باشعور اور باصلاحیت افراد اپنی صلاحیتوں کو بالواسطہ کارآمد بنانے کے بجائے براہِ راست استعمال کریں تو انسان مکانیت کی گرفت سے آزاد ہوکر لازمانی صلاحیتوں سے آشنا ہوسکتا ہے۔ سائنس دان اس مرحلے میں داخل ہوگئے ہیں کہ اگر وہ الٰہی قوانین کو سمجھ لیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے فیض یاب ہو جائیں گے اور ان کے اوپر سے مقید، مضطرب اور مغموم زندگی کا چولا اتر جائے گا۔ ان قوانین کو سمجھنے کا ذریعہ انبیائے کرام کی تعلیمات ہیں۔''

بحر جس کا زمینی کنارہ نہیں

ہر سمندر کسی نہ کسی مقام پر زمین (خشکی) سے ملتا ہے۔ بعض سمندروں کے چاروں جانب خشک زمین ہے۔ اگر معلوم نہ ہو کہ سمندر کس مقام پر کون سے براعظم سے ملتا ہے تو ایسے میں جزائر کے سلسلوں سے پانی کی حد کا تعین کیا جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ بحیرہ اوقیانوس کے مغرب میں ایک سمندر ایسا ہے جس کا کوئی کنارہ زمین سے نہیں ملتا۔ جی ہاں! بحر سارگاسو خطۂ ارض پر اپنی نوعیت کا واحد سمندر ہے جس کی حدود کا تعین اس کی لہروں سے ہوتا ہے۔

بحر سارگاسو کا پانی پُرسکون ہے، اس کے چاروں جانب بحیرہ اوقیانوس کی کلاک وائز چکر کھاتی دھاریں ہیں۔ ساخت کے فرق کی وجہ سے دونوں لہریں ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتیں۔

بحر سارگاسو اپنے گہرے نیلے رنگ کے پانی کے لئے بھی مشہور ہے۔ پانی غیر معمولی حد تک شفاف ہے۔ سطح سے 200 فٹ تک پانی کے اندر کی دنیا واضح نظر آتی ہے۔ یہ بحر 11 سو کلومیٹر چوڑا اور 32 سو کلومیٹر طویل ہے۔ اس کے مغربی کنارے کے قریب ملک برمودا واقع ہے۔ بحر کا نام یہاں سمندری پودے سرگاسوم کی نسبت سے ہے۔

محمد فرحان

اساتذہ کرام ـــ السلام علیکم

بچے کو جھوٹ بولنے سے منع کرنا علم ہے اور خود سچ بول کر اس کا مظاہرہ کرنا تربیت ہے۔ وہ جس لمحے ماں باپ کو جھوٹ بولتے دیکھتا ہے، ان کے دیئے گئے علم کی نفی کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت متضاد رویوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

ماں + باپ = بچہ

ورثہ + ماحول = شعور

والدین اور ماحول کا شعور = بچے کا شعور

ذہنی اور اخلاقی رجحانات والدین اور ماحول سے ملتے ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ آئندہ نسلوں کی تربیت میں گزشتہ کئی نسلوں کی چھاپ ہے۔ ورثے میں ملنے والے اعلیٰ اخلاق کی نشوونما برے ماحول میں مشکل ہے، اچھی صفات برے ماحول کی وجہ سے مغلوب ہوجاتی ہیں۔ ماحول ایک طرح تہذیب کی حفاظت کا سانچہ ہے۔ مثالیں بے شمار ہیں کہ روشن دماغ شخص غلط دوستوں کا رنگ اختیار کرلیتا ہے یا ذہانت کی افزائش نہ ہونے سے قابلیت پردے میں رہتی ہے۔ بچے کا ذہنی اور اخلاقی ورثہ کتنا ہی عمدہ ہو، موروثی صفات کو اجاگر کرنے میں اچھا ماحول اور صحیح تربیت ضروری ہے۔

بچہ ایک شخصیت رکھتا ہے جس کو نکھارنے کے لئے ابتدائی سال اہم ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے تجربات سے آگے کے ادوار بڑی حد تک بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اگرچہ بچے نے فطری رجحانات کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا ہے مگر طبیعت ابتدائی ماحول کے سانچے میں ڈھل کر فطرت سے دور ہوجاتی ہے۔ اس کے ڈی این اے میں انفرادی شعور کے ساتھ اسلاف کا شعور ہے اور ـــ اسلاف میں الوژن اور حقیقی دونوں رخ موجود ہیں۔

''یک سو ہوکر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جمادو۔ قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔'' (الروم: ۳۰)

ماحول میں جو تصویر بچے کے سامنے زیادہ آتی ہے، ذہن میں نقش ہوجاتی ہے۔ جب یہ نقش DNA میں

موجود ریکارڈ سے ملتا ہے تو دو رخوں کی یکجائی سے غیب ظاہر ہوتا ہے۔

★ ماحول + ڈی این اے = ذہن

★ ماحول + مثبت طرزیں = تعمیر

★ ماحول + منفی طرزیں = تخریب

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

صحبت صالح ترا صالح کند

صحبت طالح ترا طالح کند

ترجمہ: اچھی صحبت تجھے نیک اور بری صحبت تجھے برا بنا دے گی۔

آنکھ ہر وجود کو تصویر کے روپ میں دیکھتی ہے کیوں کہ ماحول تصویر کے علاوہ کچھ نہیں۔ ماحول اسٹیج یا تھیٹر کی مانند ہے جس میں سارے کردار اور احساسات موجود ہیں۔ کیمرا نما آنکھ تصویروں کو دیکھ کر پلک جھپکتی ہے، عکس دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے اور ہم آئینہ دیکھتے ہیں۔ دیکھنے میں پلک جھپکنے کا عمل اہم ہے۔ ماورائی علوم میں ایسی مشقیں ہیں جن میں پلک جھپکائے بغیر دیکھا جاتا ہے۔ اس مشق سے ڈائی مینشن ٹوٹتا ہے اور نگاہ کے سامنے اندھیرا یا سفیدی چھا جاتی ہے۔ مگر یہ مشق روحانی استاد کی نگرانی میں کی جاتی ہے ورنہ بصارت اور دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ماحول ایسی اسکرین ہے جس میں چھوٹی بڑی بہت ساری تصویریں ہیں۔ میں آم کہوں اور ذہن میں آم کی تصویر نہ بنے، آپ نہیں بتا سکتے کہ آم کیا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نام لئے بغیر صفات بتانے سے ذہن میں آم کی تصویر آجاتی ہے۔ تصویروں کے نام ہیں لیکن پہچان تصویر سے ہے۔

ایک روحانی نشست میں استاد نے شاگردوں سے پوچھا، سننے، دیکھنے، محسوس کرنے، سیکھنے اور بات کرنے کا ذریعہ کیا ہے—؟

سب نے یک زبان ہو کر بتایا— آواز۔

استاد نے پوچھا، آواز سن کر تصویر نہ بنے، کیا آپ بات سمجھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، کچھ بول سکتے ہیں—؟ شاگرد جواب کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ روحانی استاد نے فرمایا،

''یہ تصویروں کی کائنات ہے۔ یہاں ہر چیز تصویر ہے۔ بچہ وہ نہیں کرتا، جو ماں باپ کہتے ہیں، بچہ وہ کرتا ہے جو ماں باپ کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کا ذہن ہر لمحہ ماحول کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ جس تصویر کی چھاپ گہری ہو جائے، بچہ وہ تصویر بن جاتا ہے۔ بچے کے سامنے اپنی اور ماحول کی اچھی تصویر پیش کریں۔ وہ آواز سن کر نہیں سیکھ رہا، آواز کے ذریعے ذہن میں منتقل ہونے والی تصویر دیکھ رہا ہے۔''

تعلیم اور تربیت کیا ہے ــــ ؟

تعلیم سے علم منتقل ہوتا ہے اور تربیت سے علم کی چھاپ گہری ہوتی ہے۔ بچے کو جھوٹ بولنے سے منع کرنا علم ہے اور خود سچ بول کر اس کا مظاہرہ کرنا تربیت ہے۔ وہ جس لمحے ماں باپ کو جھوٹ بولتے دیکھتا ہے، ان کے دیئے گئے علم کی نفی کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت متضاد رویوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ جو کچھ بتایا جا رہا ہے، وہ اس کا الٹ دیکھ رہا ہے۔

علم مفہوم اور مشق کے ساتھ منتقل ہونا چاہئے۔

کانوں سنا واقعہ ہے کہ ماں نے چھ سالہ بیٹی سے کہا، مسلمان جھوٹ نہیں بولتے۔ ایک دن بیٹی نے ماں کو جھوٹ بولتا دیکھ کر ناراضی کا اظہار کیا اور کہا، آپ مسلمان نہیں ہیں کیوں کہ آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ بیٹی کو ماں کی بات یاد تھی۔ اس نے قول کا عمل سے موازنہ کیا اور دونوں کو مختلف پایا۔ نتیجے میں تضاد کی داغ بیل پڑی۔ ماں باپ اور گھر کے دیگر افراد کو معلوم ہونا چاہئے کہ جھوٹ نہیں بولنا علم ہے اور اس کی مشق ہونا نہ ہونا، تربیت ہے۔

مشینوں کی رفتار بڑھنے کے اثر کو ذہن نے قبول کیا ہے۔ ہم لوگ ہر کام جلدی جلدی کرنا چاہتے ہیں، پتہ نہیں ہمیں کہاں جانا ہے۔ جلدی کا شور مچا کر بھی صبح شام وہیں رہتے ہیں۔ گھر میں ماں باپ رسمی باتیں بتا کر سمجھتے ہیں کہ اچھی تربیت کی ہے اور اسکول میں اساتذہ کتابی باتیں دہرا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے سبق پڑھا لیا۔

بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو عمومی طور پر وہاں بھی تربیت کے بغیر تعلیم ہے۔ ہمارے موجودہ نظام میں کتابی اصول وقواعد یاد کرنے کو تعلیم بنا دیا گیا ہے اس لئے ایجادات اور محققین کا قحط ہے۔ جب اچھا ذہن سامنے آتا ہے تو حوصلہ افزا ماحول نہ ملنے سے دوسرے ممالک کا رخ کر لیتا ہے۔

کتابی باتیں دہرائی نہ جائیں تو چند سالوں بعد پڑھا لکھا حافظے سے مٹ جاتا ہے۔ پھر تعلیم کیا ہوئی اور کہاں گئی ــــ ؟ بچے نے جو کچھ یاد کیا، اب یاد نہیں جس کے ساتھ تعلیم بھی بھول کے خانے میں چلی گئی۔ قصور کتابوں کا نہیں، تدریس کے طریقِ کار کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نصاب میں تعلیم کے ساتھ مشق ہوتا کہ جو پڑھایا جا رہا ہے، بچہ اس پر عمل کرنا سیکھے۔ اپنا تجربہ بیان کرتا ہوں۔

حضرت علامہ اقبالؒ کی نظم بچے بچے کو یاد ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو، اس راہ پہ چلانا مجھ کو

چوتھی جماعت میں نظم پڑھی۔ تین دہائیاں گزرنے کے بعد آج بھی یاد ہے مگر افسوس! اس کا مطلب نظم یاد کرنے کے 20 سال بعد سمجھ میں آیا۔

ایک روز گنگنا رہا تھا کہ تعجب ہوا— بچہ شمع بننے کی دعا کیوں مانگتا ہے اور یہ تمنا جب میں بچہ تھا، میرے دل میں کیوں نہیں تھی—؟

نظم کا مفہوم ذہن میں نشر ہوا— شمع روشنی پھیلاتی ہے۔ شمع میں داخل ہونے والی چیزوں کی شناخت ختم ہوجاتی ہے لیکن شمع کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ وہ روشن رہ کر سب کو اپنی روشنی کا انعکاس دیتی ہے۔ شمع سانس لیتی ہے تو روشنی بھڑک کر اندر سے باہر آتی ہے اور اندھیرا دور ہوتا ہے۔ روشنی اگر اندر نہ جائے تو بجھ جاتی ہے اور اندر جا کر باہر نہ آئے تو اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ زندگی کی جلوہ آرائی شمع کے 'دم' سے ہے۔ غریبوں کی حمایت اور دردمندوں اور ضعیفوں سے محبت کے الفاظ میں انسانیت کا احترام ہے۔ برائی سے بچنا اور نیک راہ پر چلنے کی خواہش— صراطِ مستقیم کی دعا ہے۔

28 سال کی عمر میں اس انکشاف پر میں نے سوچا کہ کیا میں ذہنی طور پر اس قدر پست ہوں کہ 20 سال بعد نظم سمجھ میں آئی یا غور وفکر سے دور ہوں اور محض رٹا لگانے کو تعلیم سمجھ لیا—؟ چوتھی جماعت میں مفہوم اور اہمیت بتائی گئی ہوتی کہ میں روشنی کیسے بنوں، ساتھ میں مشق کروائی جاتی کہ ان باتوں پر عمل کیسے کرنا ہے تو بچپن کی باتیں نقش ہوجاتیں اور میں مختلف انسان ہوتا جس کی سوچ وقت کے ساتھ جوان ہوکر تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنتی۔

اساتذہ اور والدین کو چاہئے کہ کوئی بھی مضمون، کہانی یا نظم پڑھنے کے بعد مثالوں سے آسان الفاظ میں مفہوم سمجھائیں اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مشق دیں۔ بچوں میں جوش، ولولے اور خلوص کا ذخیرہ ہے، وہ جسمانی اور ذہنی سرگرمی پر ذوق وشوق سے عمل کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذکورہ نظم پڑھنے کے بعد مشق دی جائے کہ آج ہر بچہ کسی کی مدد کرکے کلاس میں رپورٹ پیش کرے۔ اگلے روز جب وہ بتائے کہ میں نے جس کی مدد کی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تو بچے سے کہیں کہ آپ نے کسی کو مسکراہٹ دے کر اندھیرے میں روشنی پھیلائی ہے، اب آپ شمع بن گئے ہیں، اسی طرح روشنی پھیلاتے رہیں۔ ان الفاظ سے اس کا ذہن کھلے گا اور وہ ان کی روشنی میں زندگی گزارے گا۔

یہ طرزِ تعلیم مشکل نہیں، بہت دلچسپ ہے۔ ماں

باپ اور اساتذہ کو اس طرز پر پڑھانے کے لئے پہلے اپنا ذہن تبدیل کرنا ہوگا۔

ہم بچوں کو پڑھنا سکھاتے ہیں، سوچنا نہیں سکھاتے اور ان کے اندر تفکر کی فطری صلاحیت کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ تعلیمی نصاب اور اساتذہ ایسے ہوں کہ سبق پڑھنے کے بعد بچہ اس سبق سے آگے سوچنا سیکھے، سوالات کرے، جوابات کی تلاش میں تحقیق کی جانب راغب ہو۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میری ڈگری محض کاغذ کا پرزہ ہے۔ اسکول و کالج کی تعلیم فرد کو اعتماد دیتی ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہے تاہم 16 سال کی تعلیم کے باوجود وہ زندگی کے اعلیٰ مقصد سے محروم رہتا ہے۔

تعلیم عمل کے ساتھ ہو، حسن معاشرت کے آئین اور رہن سہن کے آداب سکھائے۔ آدابِ معاشرت رسمی معلومات سے حاصل نہیں ہوتے۔ بچے کے پہلے استاد ماں باپ ہیں۔ والدین اور اساتذہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ بچوں کو سوچنا اور نفسِ باطن میں دیکھنا سکھائیں ورنہ ان کی ذہنی اور روحانی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

رجوع بندہ کی ہے اس طرح خدا کی طرف
پھرے ضمیر خبر جیسے مبتدا کی طرف

بعید کیا ہے مروت سے تیری اے شہ حسن
نگاہ لطف سے دیکھے جو تو گدا کی طرف

کہاں وہ زلف کہاں خون نافۂ آہو
جو مشک سمجھے ہیں وہ لوگ ہیں خطا کی طرف

الجھ کے شانے سے کھاتا ہے سینکڑوں جھٹکے
قصور سے یہ تیرے گیسوئے رسا کی طرف

خدا نے درد محبت عطا کیا ہے جسے
اسے توجہ خاطر نہیں دوا کی طرف

ملا جو تم نے لہو دست و پا میں عاشق کا
نہ ہوگا میل طبیعت کو پھر حنا کی طرف

کرے گا یار مری جنگ غیر میں امداد
جو آشنا ہیں وہ ہوتے ہیں آشنا کی طرف

فراق یار میں رہتا ہے یوں تصور گور
خیال جیسے مسافر کا ہو سرا کی طرف

نہ ہوگا ہم سفر روح پیکر خاکی
یہ سوئے ارض رواں ہوگا وہ سما کی طرف

بہت خراب رہا بت کدے میں اے آتشؔ
خدا پرست ہے چل خانۂ خدا کی طرف

(کلام: خواجہ حیدر علی آتشؔ)

روٹی خور ــــ؟

پانی کا جہاز طغیانی میں آ گیا۔ سمندر کی لہروں نے تین منزلہ جہاز کو چھلّے کی طرح اچھالا۔ دوسرے مسافروں کا کیا بنا، اللہ جانتا ہے، قاضی صاحب ڈوبتے ابھرتے ساحل تک پہنچ گئے۔ ہوش وحواس بحال ہوئے تو بھوک پیاس لگی۔ سخت بے چینی اور اضطراب میں تھے کہ دور سے سایہ قریب آتا نظر آیا۔

آدمی پیروں کے بل زمین سے لٹکا ہوا ہے۔ زمین اپنے محور کے گرد گردش کر رہی ہے۔ چاند، سورج اور ستارے دائرے میں تیر رہے ہیں۔ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ اشجار کششِ ثقل سے آزاد ہونے کی کوشش میں ہیں۔ طیور فضا میں محوِ پرواز ہیں۔ ہوا ذرّات کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جا رہی ہے۔ پانی جس کی فطرت نشیب میں بہنا ہے، درختوں میں اوپر کی طرف جاتا ہے اور انتہا یہ ہے کہ 80 فٹ ناریل کے درخت پر پیالوں میں جمع ہو کر لٹک جاتا ہے۔ پانی کا ہر روپ مختلف کیمیائی عمل سے گزر کر واپس زمین میں شامل ہو رہا ہے۔ ہر تخلیق حرکت میں ہے اور ایک دور (سائیکل) پورا کر کے بار بار ظاہر ہو رہی ہے۔

تخلیقات میں گندم اور چاول بھی ہیں۔

باپ بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں تھیں جن کی خوش بو گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ سب کھانے میں مگن تھے کہ اچانک باپ کے حلق میں روٹی کا ٹکڑا پھنس گیا۔ چہرہ سرخ ہوا اور سانس لینا مشکل ہو گیا۔ بیٹی نے تیزی سے گلاس میں پانی ڈالا اور حلق میں انڈیلا۔ بیٹوں نے کمر تھپتھپائی۔ نوالہ حلق میں گیا اور سب کی جان میں جان آئی۔

باپ بچوں کا ذہن کھانے سے ہٹ کر روٹی کے ٹکڑے میں اٹک گیا۔

بیٹی بولی، روٹی سے جسم میں توانائی بنتی ہے لیکن یہ حلق میں پھنس جائے تو جان لے سکتی ہے۔

بیٹے نے پوچھا، رکاوٹ کے بغیر کئی نوالے حلق سے اتر گئے، ایک کیوں رک گیا؟ کیا کھانا حلق سے اتارنے پر ہمارا کوئی اختیار نہیں؟

باپ نے کہا، بچو! قدرت نے ہمیں متوجہ کیا ہے

کہ آدمی تمام آسائشوں کے باوجود اللہ کے بنائے ہوئے نظام کا پابند ہے۔

جب زمین پر آدم نہیں تھا، گندم موجود تھی۔ آدم و حوا کی نسل بڑھی تو ضرب (x) تقسیم (÷) کا فارمولا وجود میں آیا۔ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے 16 ہوئے ـــ آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ زندگی کی بیلٹ چلتی رہی اور نوعِ آدم کے شعور نے ارتقائی مراحل طے کیے۔

جب ابا آدم اور اماں حوّا کا دور آگے بڑھا تو انہیں گندم کاشت کرنے کا خیال آیا۔ زمین کے چھوٹے بڑے حصے کر کے کھیت بنائے گئے اور گندم بوئی گئی۔ مٹی جب سورج کی روشنی اور پانی سے ملی تو مٹی میں دبا ہوا گندم کا بیج کھلا، زمین کی سطح سے باہر آیا، فصل بڑھی اور گندم کی بالیں بھر گئیں۔ ثابت گندم کو پیسنے کے لئے چکّی ایجاد ہوئی۔ چکّی میں آٹا پسا، آٹے سے روٹی بنی۔ وقت گزرنے کے ساتھ گندم کے استعمال کے طریقوں میں جدت آئی لیکن روٹی، آج بھی روٹی ہے اور گندم ہزار اشکال میں مرکب ہونے کے باوجود گندم ہے۔

گندم کے دانے نے کہانی سنائی۔

دنیا کا ظہور ہوا تو مجھے زمین پر پھینک دیا گیا۔ میں تنہا تھا۔ کوئی ہم نشین و غم گسار نہیں تھا۔ زمین سب کی ماں ہے، اپنے لختِ جگر یعنی میری آہ و زاری سنی اور ممتا کے جوش سے میرے لئے اپنی آغوش وا کر دی۔ ماں کی گود کے لمس سے مجھے قرار آیا اور میں سکون و راحت سے آشنا ہوا۔ سکون کی لہروں میں زمین کے اندر دوڑنے والی رنگ رنگ لہریں ملیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہوئیں تو میری نسل کا آغاز ہوا۔

اِدھر میری (گندم) نسل پروان چڑھی، اُدھر مجھے خوراک بنا کر بابا آدم کی اولاد دنیا میں پھیلتی گئی۔ آدم کی نسل نے اپنی خوراک کے لئے میرا انتخاب کر کے دراصل نوعِ گندم کی خدمات کا اعتراف کیا ہے لیکن ہماری نسل نے بھی اپنے محسن، آدم کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

میرے آباؤ اجداد اور خاندان ہے۔ ہم میں سے کوئی پستہ قد اور کوئی دراز ہے۔ ہم بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک صلاحیت یہ ہے کہ ہمارے اندر خود سپردگی ہے۔ ہمیں پیاز کے ساتھ کھاؤ یا قورمے کے ساتھ، چٹنی کے ساتھ کھاؤ یا نہاری کے ساتھ، پیس کر استعمال کرو یا ثابت یا آگ میں پکاؤ، ہم نے کبھی احتجاج کیا نہ کوئی سوال۔ ہماری زندگی ایثار ہے۔ ہمارا کام خود کو فنا کر کے مخلوق کو حرارت پہنچانا ہے لیکن ـــ حیرت اس بات کی ہے کہ ہم فنا

ہوکر بھی موجود رہتے ہیں۔

خواتین وحضرات! کہتے ہیں کہ روٹی فساد کی جڑ ہے۔روٹی سے مراد پیٹ اور فساد ختم نہ ہونے والی خواہشات ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں اور حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔ جتنا فساد روٹی خور آدم کرتا ہے، گوشت خور شیر نہیں کرتا۔

روٹی بھی عجیب ہے۔ ذائقے میں تنوع کے لئے گندم میں آمیزش کر کے اس کے مختلف نام رکھے گئے۔ روٹی خور آدمی ترقی کے مراحل طے کرتا رہا اور روٹی ـــ روتی رہی۔

بزرگوں سے روایت سنی ہے کہ ـــ فقیر اور قاضی گہرے دوست تھے۔ قاضی کا کہنا تھا کہ مذہب کے پانچ ارکان ہیں۔ فقیر نوعِ آدم کی جبلّت سے واقف تھا کہ آدمی پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہے اور بھوک مٹانے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ آدمی کی جبلّت کو دیکھتے ہوئے فقیر کا خیال تھا کہ ایک چھٹا رکن بھی ہے۔

قاضی صاحب حج کو گئے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز نہیں تھے۔ پانی کا جہاز طغیانی میں آ گیا۔ سمندر کی لہروں نے تین منزلہ جہاز کو چھلکے کی طرح اچھالا۔ دوسرے مسافروں کا کیا بنا، اللہ جانتا ہے، قاضی صاحب ڈوبتے ابھرتے ساحل تک پہنچ گئے۔

ہوش وحواس بحال ہوئے تو بھوک پیاس لگی۔ سخت بے چینی اور اضطراب میں تھے کہ دور سے سایہ قریب آتا نظر آیا۔ قاضی صاحب نے ہمت کی اور سائے کی طرف بڑھے۔ دونوں قریب ہوئے۔

گوشت پوست سے بے نیاز سائے نے پوچھا کہ خیریت ہے، بیابان میں کیا کر رہے ہو؟

قاضی صاحب بولے، حج کا ارادہ تھا لیکن جہاز طوفان کی زد میں آ گیا۔ پتہ نہیں میں کس طرح ساحل تک پہنچا۔ جہاز کہیں نظر نہیں آتا اور ساتھی مسافروں کی خبر نہیں۔ بھوک پیاس سے نڈھال ہوں۔

ماورائی وجود نے پرچہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، اپنی آدھی نیکیاں میرے نام لکھ دو، پانی مل جائے گا۔

پیاس کے ہاتھوں مجبور قاضی نے تاخیر کے بغیر آدھی نیکیاں لکھ دیں اور پانی پی لیا۔ پیاس بجھ گئی لیکن پیٹ گندم سے خالی تھا۔ بھوک برداشت نہیں ہوئی تو سائے سے روٹی مانگی۔

ماورائی وجود یعنی سائے نے کہا، روٹی کھانی ہے تو باقی آدھی نیکیاں بھی میرے نام کردو۔

روٹی کے لئے مضطرب قاضی صاحب نے اپنی آدھی رہ جانے والی نیکیاں بھی پرچے پر لکھ کر ماورائی وجود کے نام کردیں اور بھوک رفع کی۔

قاضی صاحب گھر لوٹے اور اگلے روز ملاقات کے لئے اپنے فقیر دوست کے پاس گئے۔

باتوں باتوں میں فقیر نے پوچھا، اے قاضی! رکن پانچ ہیں یا چھ ــــ؟ قاضی نے کہا، رکن پانچ ہیں۔ فقیر نے اپنی گدڑی ٹٹولی اور قاضی کے لکھے ہوئے دونوں پرچے سامنے رکھ دیئے۔

مذہب کے رکن پانچ ہیں لیکن آدمی نے زندگی کا محور روٹی کو بنا کر اصل سے توجہ ہٹالی ہے۔ تمثیل کے ذریعے متوجہ کیا گیا ہے کہ بندہ ہوش کے ناخن لے اور دیکھے کہ وہ کیا چھوڑ کر کس چیز کی طرف دوڑ رہا ہے۔ بتایئے کہ چھٹا رکن کیوں لکھا گیا ہے؟

صحیح جواب پر اماں روغنی روٹی پکا کر دیں گی۔

روٹی کیا ہےــــ؟ روٹی بھوک کا تمثل اور ایسا مظہر ہے جس پر اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اسی کی وجہ سے حسیات زندہ یا مردہ ہیں۔

آدمی پیروں کے بل زمین سے لٹکا ہوا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں چل رہا ہوں۔ چلنے کی حالت اختیاری ہے اور لٹکنے کی حالت غیر اختیاری ہے۔

پیدائش سے لے کر موت تک پوری زندگی کا جائزہ لیں اور بتائیں کہ زندگی کے بنیادی امور میں کون سا ایسا عمل ہے جس پر آدمی کو اختیار ہےــــ؟ پیدائش و موت پر اختیار نہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور رشتہ داروں کے انتخاب پر اختیار نہیں۔ گھٹنے بڑھنے پر اختیار نہیں۔ کیا کھانا ہے اس پر کسی حد تک اختیار ہے لیکن مخلوق کھانے سے بے نیاز نہیں ہے۔ آدمی پانی کم یا زیادہ پی سکتا ہےــــ پانی کے بغیر اس کا وجود نہیں۔ جبلّی تقاضوں میں وہ ایک حد تک بااختیار ہے مگر جبلّت بھی فطری تقاضوں کی پابند ہے۔ بھوک کا خیال نہ آئے، وہ کھانا نہیں کھاسکتا۔

جو آدمی پیٹ کا غلام بن جاتا ہے، اس کی بھوک روٹی سے بھی دور نہیں ہوتی۔ وہ لالچ میں آکر گندم ذخیرہ کر کے اپنے بہن بھائیوں کا حق مارتا ہے۔ ایسے فرد کا تشخص برباد، کردار تباہ اور شناخت ختم ہوجاتی ہے، ذہن ماؤف اور دل مردہ ہوجاتا ہے اور وہ بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔

جسم کے گھٹنے بڑھنے سے بھوک کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ تقاضے کی تسکین کے کچھ وقفے بعد دوبارہ بھوک لگتی ہے۔ گندم جسم کی ضرورت ہے لیکن پیٹ گندم سے نہیں بھرتا۔ ایسا ہوتا تو پہلی بار کھانے کے بعد کوئی دوبارہ گندم یا روٹی نہیں کھاتا۔

قارئین! مضمون آپ نے پڑھا لیکن یہ بات صحیح ہے کہ تشنگی دور نہیں ہوئی۔ درخواست ہے کہ 'روٹی خور' کے عنوان سے جو تحریر آپ نے پڑھی ہے اس کے بارے میں تبصرہ کریں۔ ادارہ نہایت شکر گزاری کے ساتھ شائع کرے گا۔

زاہدہ تبسم

خوش خبری سنائیں ہوائیں

قارئین! ' خوش خبری سنائیں ہوائیں ' کے عنوان سے کائناتی تخلیق کا ایک باب ستمبر 2020ء میں پیش کیا جارہا ہے۔ اولی الالباب خواتین وحضرات اور سائنسی طالبات وطلبا کے لئے ادارے کی طرف سے دعوت ہے کہ اس سلسلے میں کوشش کریں۔ سورہ نور کی آیت 35 کی روشنی میں مفہوم کی وضاحت کریں۔ نام کے ساتھ اگر تعلیمی قابلیت لکھ دیں تو ادارہ مشکور ہوگا۔ (مدیر)

ہوا گیسوں پر مشتمل ہے جن میں ایک گیس آکسیجن ہے۔ نظامِ تنفس میں اہم کردار کی وجہ سے جان داروں کی بڑی تعداد کا انحصار آکسیجن پر ہے۔ یہ اللہ کی ایسی تخلیق ہے جو ہر لحہ زندگی عطا کرتی ہے۔ نباتات میں یہ کردار کاربن ڈائی آکسائڈ کا ہے۔ ان دو گیسوں سمیت ہر وہ گیس جو حیات کے توازن کو برقرار رکھتی ہے، اس کے بارے میں ارشادِ باری ہے:

''اور وہی ہے کہ ہوائیں بھیجتا ہے اس کی رحمت کے آگے خوش خبری سناتیں۔'' (الاعراف: ۵۷)

مضمون آکسیجن پر ہے اور جسم میں آکسیجن کی مقدار میں اضافے کا ذریعہ ورزش یا جسمانی سرگرمی ہے۔ ورزش کے ذہن پر اثرات کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ دماغ اور حرکت کے مابین مضبوط ربط پایا جاتا ہے۔ ورزش سے دماغی خلیات حرکت میں آتے ہیں اور ذہنی کارکردگی بڑھتی ہے۔

تحقیق کے دوران طالب علموں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے گروپ کو ہدایت تھی کہ وہ کلاس سے پہلے gym میں ورزش کریں۔ دوسرے گروپ کو کلاس میں رہنے، مطالعہ کرنے اور نیند آنے پر سونے کی اجازت تھی۔ گروپ اول کو ورزش کرنا مشکل لگا۔ وہ کلاس میں آنے سے پہلے تھک جاتا تھا البتہ کچھ عرصے میں ورزش کے فوائد ظاہر ہوئے، سکت میں اضافہ ہوا اور طلبا نے خود کو توانا محسوس کیا۔ امتحان ہوا تو ورزش والے گروپ نے 70 گنا زیادہ نمبر لئے۔ طلبا نے فرق محسوس کیا کہ ورزش سے سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایک اور سروے میں 38 رضا کاروں کو 20 منٹ تک ورزش کروائی گئی جس سے ان میں ایسے کیمیائی

مادوں کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا جن کا تعلق یادداشت اور خوش گوار طبیعت سے ہے۔ دیگر جسمانی نظام پر بھی مثبت اثرات ظاہر ہوئے۔

ورزش (حرکت) کیا ہے ــــ؟

حرکت تقاضا ہے جو باطن (ذہن) سے ظاہر میں منتقل ہوتا ہے ورنہ حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔ جسم ارادی اور غیر ارادی حرکات کا مظاہرہ ہے۔

انسان کھربوں خلیات کا مجموعہ ہے جن میں مستقل ارتعاش ہوتا ہے۔ ان خلیوں کو توانائی آکسیجن کے ذریعے ملتی ہے۔

مثال ۱: جگر کے ایک خلیے میں سینکڑوں کیمیائی تعاملات (chemical reactions) سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں واقع ہوتے ہیں۔

کیمیائی تعامل کی سادہ وضاحت:

''مالیکیول A، مالیکیول B کے ساتھ مل کر نیا مرکب C بناتا ہے یا دوسری صورت میں مرکب C ٹوٹ کر A اور B میں تحلیل ہو جاتا ہے۔''

کیمیائی تعامل کے مجموعے کو میٹابولزم کہتے ہیں۔ جگر کے خلیے میٹابولزم کا اہم اور ابتدائی مقام ہیں۔ خلیے واقف ہیں کہ غذا کتنی مقدار میں ذخیرہ کر کے کس طرح استعمال کرنی ہے، خلیوں کی مرمت کے لئے کہاں پر مادے تخلیق کرنے ہیں اور کس مقام کے زہریلے مادوں کو توڑ کر خارج کرنا ہے۔

مثال ۲: بالغ شخص کی رگوں میں اندازاً 4.7 سے پانچ لیٹر خون ہر وقت دَور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت اور ہمارے اختیار کے بغیر دل کی ڈیوٹی ہے کہ وہ ہر خلیے کو خون کے ذریعے غذا، توانائی اور آکسیجن فراہم کرے۔

قرآن کریم کے مطابق ہر شے دائرے میں تیر رہی ہے۔ روشنیوں سے بنا ہوا وجود ہو یا مٹی سے مرکب جسم، معین مقداروں کے مطابق حرکت میں ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی نہ ہو تو مقداریں، مقداریں نہیں رہتیں یا زندگی ناتوانی میں گزر جاتی ہے۔

اب تک لکھی گئی تحریر کا خلاصہ یہ ہے۔

★ حرکت باطن سے منتقل ہوتی ہے۔

★ جسم باطن کے تابع ہو کر عمل کرتا ہے۔

★ فطرت کے مطابق حرکت سے خلیات چارج ہوتے ہیں اور تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

★ حرکت کے لئے توانائی درکار ہے۔ توانائی کے حصول میں آکسیجن کا کردار اہم ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ زمینی فضا میں تقریباً 21 فی صد آکسیجن پائی جاتی ہے۔ آکسیجن خارج کرنے والی مخلوقات میں سبز الجی، نباتات اور سمندری بیکٹیریا وغیرہ ہیں۔ محقق اس گیس کو پانی کا اہم جزو کہتے ہیں۔

یہ تمام مخلوقات کے کیمیائی عمل میں شامل ہے۔

قشرِ ارض کا 46 فی صد آکسیجن پر مشتمل ہے اور یہ کائنات کا تیسرا بڑا عنصر بتایا جاتا ہے۔

پہلا بڑا عنصر ہائیڈروجن ہے۔

ہیلیم دوسرے درجے پر کثیر مقدار میں ہے۔

چوتھے درجے پر کاربن ہے۔

اور نیون گیس پانچویں درجے پر ہے۔

ہر جان دار کو بقا کے لئے توانائی چاہئے۔ پودے سورج سے آنے والی توانائی جذب کر کے ضیائی تالیف (photosynthesis) کے ذریعے غذا تیار کرتے ہیں۔ پتّے میں داخل ہونے والے پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ میں موجود آکسیجن جب ٹوٹ کر فضا میں بکھرتی ہے تو ہم اسے سانس لینے میں استعمال کرتے ہیں۔

جسم حرارتی انجن ہے جس کی بقا حدت و ٹھنڈک دونوں میں ہے۔ آکسیجن کی مدد سے غذا میں کیمیائی توانائی حرکت کے لئے خرچ ہوتی ہے اور یہ توانائی عملِ تکسید سے گزر کر بنتی ہے۔ جب آکسیجن گلوکوز یا دیگر غذائی سالمات (مالیکیولز) کو تحلیل کر کے ایندھن کے طور پر استعمال کرتی ہے تو اسے عملِ تکسید کہتے ہیں۔ خون غذا کے سالمات کو ہر خلیے تک لے جاتا ہے اور پھیپھڑوں سے آکسیجن حاصل کر کے غذائی ذرّات تک پہنچاتا ہے۔

ورزش یا جسمانی سرگرمی کے دوران خوراک ہضم ہونے اور خون میں آکسیجن شامل ہونے کی رفتار بڑھنے سے اعضا کو زیادہ توانائی درکار ہوتی ہے جو زائد خوراک اور آکسیجن کے ملاپ سے حاصل کی جاتی ہے۔ نتیجے میں جسمانی حرارت میں اضافہ ہوتا ہے۔

حرارت ایک خلیے سے دوسرے خلیے اور ایک عضو سے دوسرے عضو میں منتقل ہوتی ہے۔ اس عمل سے مقداروں کی گردش اعضا میں لچک برقرار رکھتی ہے۔ حرارت کی مقداریں (کیلوریز) اعضا میں حرکت اور خلیوں کی مرمت کرتی ہیں اور ایندھن ملنے سے نئے خلیے بنتے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ جسمانی خلیوں کے لئے غذا کے ساتھ آکسیجن ضروری ہے۔

سال 2019ء کا نوبل انعام برائے فزیالوجی اور میڈیسن اس ریسرچ پر دیا گیا کہ جسمانی خلیے کس طرح آکسیجن کی سطح کو محسوس کرتے اور ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں کامیابی سے مختلف بیماریوں سے حفاظت کے وسیع امکانات ہیں۔

آکسیجن کے نظام کی افادیت کے لئے جسم کا حرکت میں رہنا اور ورزش معاون ہے۔ مشین طویل عرصے تک استعمال نہ کرنے سے خراب ہو جاتی ہے۔ ہاتھ دو تین گھنٹے بندھے ہوئے ہوں تو

کافی دیر تک حرکت کے قابل نہیں رہتے۔

تحقیق سے ثابت ہے کہ ورزش، چہل قدمی اور صبح جلد بیدار ہونے والے افراد میں ایسے انزائم، ہارمونز اور دیگر کیمیائی مادوں میں اضافہ ہوتا ہے جن کا تعلق صحت مند ذہن اور جسم سے ہے۔ مشاہدہ ہے:

★ ورزش کے دوران یا اس کے بعد دماغ میں اعصاب کو تقویت پہنچانے والے پروٹین کی نشوونما تیز ہوتی ہے۔ اس پروٹین کا تعلق سوچنے، سمجھنے اور تخلیقی صلاحیتوں سے ہے۔

★ مائٹوکونڈریا کو خلیوں میں توانائی کا اسٹوریج ہاؤس کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے اجسام ہیں جو خلیوں میں عملِ تنفس کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ایسے کیمیائی مادے خارج کرتے ہیں جن سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ توانائی مائٹوکونڈریا میں جمع ہوکر مختلف کاموں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ ورزش سے اس کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔

★ ٹائپ ٹو ذیابیطس، دل کی بیماریوں اور کینسر کے خطرات کم سے کم ہوجاتے ہیں۔

آکسیجن کا ذکر سانس کی مشق کے بغیر ادھورا ہے۔ سانس ایسی حرکت اور ٹھہراؤ کا مجموعہ ہے جس میں ذہن، جسم اور روح ہم آہنگ ہیں۔ سانس آہستہ لینے سے پُرسکون لہریں متحرک ہوتی ہیں اور آکسیجن داخل اور جذب ہونے کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔

◯ اللہ کے نائب کی حیثیت سے انسان آکسیجن کی ایکویشن اور افادیت سے واقف ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم میں زندگی کے قوانین وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور وہی ہے کہ ہوائیں بھیجتا ہے اس کی رحمت کے آگے خوش خبری سناتیں۔'' (الاعراف: ۵۷)

★ ہوا گیسوں اور آبی بخارات کا مجموعہ ہے۔

★ ہوا میں ایک اہم جزو آکسیجن ہے۔

★ خوش خبری کے معنی اطلاع ہے۔

★ رحمت، کائنات کے ذرّے ذرّے کو ملنے والی لائف اسٹریم ہے۔

ہوا کے ذریعے مخلوقات کو لائف اسٹریم منتقل ہوتی ہے۔ نتیجے میں زمین پر مخلوقات چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ہوا میں مخفی اطلاعات حیوانات، نباتات اور آدمی میں حرکت بن رہی ہیں۔ ان میں ایک اطلاع وہ گیس ہے جس کو محقق نے آکسیجن کا نام دیا ہے۔ آکسیجن کا باطنی رخ روشنی ہے۔ روشنی کا اظہار رنگ میں ہوتا ہے اور رنگ ـــ مقدار ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

''اور اس نے تمہارے لئے رنگ برنگ کی چیزیں زمین میں پیدا کی ہیں۔ ان میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' (النحل: ۱۳)

ہر مقدار نور کے دائرے میں بند ہے۔ نور سے

واقف ہوکر آکسیجن کی کنہ سے تعارف ہو جاتا ہے۔

سورہ نور میں تخلیقی ایکویشن بیان ہوئی ہے۔

۱۔ اللہ

۲۔ نور ہے

۳۔ سماوات اور ارض کا

۴۔ نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق

۵۔ طاق میں چراغ ہے

۶۔ چراغ قندیل میں ہے

۷۔ قندیل جیسے موتی کی طرح چمکتا تارا

۸۔ زیتون کے درخت سے چراغ روشن ہے

۹۔ روشنی مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف

۱۰۔ ایسے بھڑکتا ہے جیسے ابھی نہ لگی ہو اس میں آگ

۱۱۔ نور پر نور

۱۲۔ اللہ راہ نمائی فرماتا ہے نور کی

۱۳۔ جس کو چاہتا ہے

۱۴۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے

۱۵۔ اور اللہ ہر شے سے واقف ہے

نور کا دائرہ روح کا زون ہے۔ روح جسم سے نکل جائے تو آکسیجن کی موجودگی کے باوجود، جسم مردہ ہے۔ مادی اجسام اور آکسیجن کا میکانزم روح کے تابع ہے اور روح اللہ کا امر ہے۔

تصور یار کا جب تک فنا پیہم نہیں ہوتا

اندھیرے لاکھ چھا جائیں اجالا کم نہیں ہوتا
چراغ آزرو جل کر کبھی مدھم نہیں ہوتا

مسیحا وہ نہ ہوں تو درد الفت کم نہیں ہوتا
یہ زخم عشق ہے اس زخم کا مرہم نہیں ہوتا

غم جاناں کو جان جاں بنالے دیکھ دیوانے
غم جاناں سے بڑھ کر اور کوئی غم نہیں ہوتا

طلب بن کر مری ہر دم وہ میرے ساتھ رہتے ہیں
کبھی تنہا مری تنہائی کا عالم نہیں ہوتا

تمہارا آستانہ چھوڑ کر آخر کہاں جاؤں
دیا ہے درد دل تم نے وہ دل سے کم نہیں ہوتا

مرا تن من جلا کر تو نے ظالم خاک کر ڈالا
مگر اے سوز الفت تیرا شعلہ کم نہیں ہوتا

ترے در سے مجھے اتنی محبت ہوگئی جاناں
ترے در کے علاوہ سر کہیں بھی خم نہیں ہوتا

بدلتی ہی نہیں قسمت محبت کرنے والوں کی
تصور یار کا جب تک فنا پیہم نہیں ہوتا

سمجھ لیجے کہ جذب دل میں ہے کوئی کمی باقی
اگر دیدار ان کا عشق میں ہر دم نہیں ہوتا

(کلام: فنا بلند شہری)

سب سے بڑی محرومی ــــ؟

کائنات میں ہر چیز کا ایک تشخص ہے۔ یہ تشخص ہی پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے۔ یہ تشخص کائنات کی تخلیق سے پہلے متعین کر دیا گیا ہے۔ جب ہم کائنات کی تخلیق سے پہلے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تشخص ہی حقیقی ہے، خواہ وہ ذرّے میں ہو، ستارے میں ہو، چاند میں ہو، سورج میں ہو، زمین میں ہو یا آدمی میں ہو۔

آدمی کا ہر کردار پہلے سے ماضی میں ریکارڈ ہے۔ ماضی میں موجود کسی بھی کردار یا صلاحیت کو آدمی جتنا بیدار کرے، اتنا ہی وہ صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں پر آدمی ڈاکٹر بھی ہے، انجینئر بھی ہے، ٹیچر بھی ہے، محقق بھی ہے۔ جو شخص انجینئر بننا چاہے، وہ اپنے اندر ریکارڈ انجینئرنگ کی صلاحیت کو بیدار کر لے تو وہ انجینئر بن جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے اندر موجود ڈاکٹر کی صلاحیت کو بیدار کرنے سے ڈاکٹر بن جاتا ہے۔

جو شخص اپنی ذات سے باخبر ہو جائے وہ ایسی دنیا میں داخل ہوتا ہے جہاں رنج و الم، عدم تحفظ، پریشانی، بے سکونی اور ذہنی انتشار نہیں ہے۔ اس صلاحیت کو بیدار کرنے کے لئے جس درجے میں جدوجہد ہوگی، اسی مناسبت سے کام یابی ملے گی۔ اور جب کوئی شخص اپنی صلاحیتوں کی حقیقت اور کارکردگی سے بے خبر رہتا ہے تو وہ اپنی ذات کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ وہ یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی ذات کہاں تک محیط ہے اور یہی آدمی کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

قرآن کریم میں آدمی اور انسان دونوں کا بالوضاحت تذکرہ ہے۔

قارئین! بتایئے کہ آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے؟ آدمی کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے جب کہ گونگا، بہرا یہاں کوئی بھی نہیں، سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔

عرفانہ شہزاد

کِس نے کہا اور کِس نے سنا

ایک در پکڑ اور مضبوط پکڑ اور اپنے پَر اس کی دہلیز پر جلا دے۔

دسمبر 1995ء کی ایک شام، سرما کی خنک ہوا کے دوش پر اڑتے پرندوں کا غول دیکھ کر گہری شناسائی کا احساس ہوا۔ پرندوں کا منزل سے فاصلہ کم ہو رہا تھا اور میں ابھی تک راستے کی تلاش میں تھی۔ انہیں پکارا، مجھے کہاں چھوڑے جاتے ہو، آج آواز دے ہی دو۔ شاید تمہارے قافلے میں شامل ہو کر میں اس سرزمین میں داخل ہو جاؤں جہاں 'روشن یقین' ہوتا ہے۔

صبح ماموں کے گھر سے پمفلٹ آیا جو لاہور میں کسی دارالمطالعہ کی افتتاحی تقریب کے بارے میں تھا۔ پمفلٹ پر 'مرکزی پتہ' دیکھ کر دل نے کہا کہ خواب کی تعبیر کراچی میں ہے۔ میں معلومات کے لئے والدہ کے ہمراہ دارالمطالعہ گئی۔

منتظم سے کہا، ممکن ہے باقاعدگی سے نہ آسکوں، کیا آپ کے بزرگ سے ملاقات ہو سکتی ہے—؟

انہوں نے بتایا کہ وہ افتتاحی تقریب کے موقع پر کراچی سے تشریف لائیں گے۔

پہلی ملاقات تھی— وہ سامنے بیٹھے تھے۔

گفتگو کا موضوع 'خواتین کے حقوق' تھا۔

میں نے اتنا پُرسکون چہرہ نہیں دیکھا۔ ذہن کی اسکرین پر وہ دن آج بھی نقش ہے۔ عقیدت مند ان کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ میری حالت یہ تھی کہ میں انہیں دیکھ سکتی تھی یا سن سکتی تھی۔ سننا اور دیکھنا ایک ساتھ ممکن نہیں تھا۔ دیکھتی تو کچھ سنائی نہ دیتا اور سنتی تو آنکھیں بند ہو جاتیں۔

پہلی بار تجربہ ہوا کہ آواز کی لہریں نور کی شعاعیں ہیں جو سماعت میں داخل ہوتی ہیں اور دل کو اللہ کی محبت سے لبریز کر دیتی ہیں۔ بزرگ نے خواتین و حضرات کو اللہ کے کلام میں تفکر کی تلقین کی۔

خطاب کے بعد ملاقات کے لئے لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں ایک تھی۔ ماحول پر ملکوتی مسکراہٹ محیط تھی۔ پتہ نہیں دل میں اتنا گداز کہاں سے آیا کہ ہچکی بندھ گئی۔ میری باری آئی۔ انہوں نے اشک بہنے کی وجہ پوچھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں

آیا کہ کیا کہوں۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں عرض کیا، سکون کی تلاش ہے۔ سکون نہیں ملتا۔

فرمایا، کیوں نہیں ملتا سکون ––– ؟

سوال پوچھ کر وہ اٹھے اور سب کو سلام کر کے تشریف لے گئے۔ میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔

کیوں نہیں ملتا سکون ––– ؟ الفاظ سماعت میں داخل ہوتے ہی وجود میں ٹھنڈک پھیل گئی۔ احساس خوش گوار تھا اور دیر تک قائم رہا۔ یادداشت بتارہی تھی کہ میں اس کیفیت سے پہلے گزر چکی ہوں۔

بچپن میں کسی فلم میں لڑائی کا منظر دیکھا جس سے ذہن پریشان ہوگیا اور دن میں آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں نے کمرے میں بلب روشن کیا لیکن اندھیرا کم نہ ہوا۔ مدد کے لئے اللہ کو پکارا۔ تھوڑی دیر میں جھماکا ہوا ––– ذہن کو اطلاع ملی کہ اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ میں نے دوڑ کر قرآن کریم اٹھایا اور سینے سے لگایا ––– وجود میں ٹھنڈک اتر گئی۔ بے شک جو لوگ اللہ کا کلام پڑھتے ہیں اور اس میں تفکر کرتے ہیں، وہ اللہ کے دوست بن جاتے ہیں اور اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔

''سن رکھو! بے شک اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔'' (یونس: ۶۲)

بے وقوفی پر ہنسی آئی کہ کمرے کا بلب روشن کردیا لیکن دل کا اندھیرا دور نہیں کیا۔

بہت دنوں تک جسم میں لطافت غالب رہی۔

دارالمطالعہ میں بزرگ کی کئی کتابیں تھیں جن میں روحانی علوم پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ میں ایک کتاب گھر لائی اور ابو کو دی۔ کتاب پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئے اور رائے دی کہ یہ کسی عام شخص کی تحریر نہیں۔

ابو نے 18 ستمبر 1996ء کو ہائیکورٹ کے ہال میں بزرگ کے لیکچر کا انتظام کیا جس میں، میں نے بھی شرکت کی۔ ہائیکورٹ کا ہال وکلا اور دیگر شعبۂ زندگی کے افراد سے بھرا ہوا تھا۔ کرسیاں کم پڑ گئیں۔ ہال کے باہر بھی لوگ کھڑے ہمہ تن گوش تھے۔

گھر آ کر ابو نے مجھ سے کہا کہ میں نے اس ہال میں اتنے افراد کی موجودگی میں پہلی مرتبہ خاموشی اور تنظیم دیکھی۔

ہال میں انجان لوگ بھی از خود خاموش اور باادب تھے۔ دارالمطالعہ کی طرح یہاں بھی وہی عالم تھا۔ بزرگ کی بے نیاز طبیعت اور نورانی کشش نے ہر ایک کو پُرسکون کردیا۔

لیکچر ختم ہوا تو انہوں نے میرے ابو سے فرمایا، فاروقی صاحب! یہ سب اللہ کی دین ہے۔

چند دنوں بعد ڈرتے ڈرتے ابو سے اجازت لی کہ بزرگ سمن آباد میں ٹھہرے ہوئے ہیں، میں خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہوں۔ یہ پہلی اجازت تھی جو والدین کے بغیر گھر سے باہر جانے کے لئے ملی۔

بزرگ سامنے تھے۔ انہوں نے سرمہ لگایا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش سرمہ نہ لگاتے تا کہ آنکھوں کا اپنا رنگ نظر آتا۔ انہوں نے فوراً انگلی آنکھ پر رکھی اور فرمایا، رات کو آنکھیں دکھ رہی تھیں، سرمہ لگا لیا۔

میں نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔

سب میری سوچ سے بے خبر تھے۔

عرض کیا، جناب! بیعت ہونا چاہتی ہوں۔

فرمایا، والدین کی اجازت سے آؤ۔ ایک مائی صاحبہ کہتی تھیں کہ رب راضی، سب راضی!

خیال آیا کہ مجھے بھی سب کے بجائے رب کو راضی کرنا چاہئے۔ گھر جاتے وقت انہوں نے شفقت سے پوچھا، بیٹی! آپ بھی جا رہی ہیں —؟ جی چاہا کہ زمین قدم جکڑ لے اور میں یہیں رہ جاؤں۔

جو جس غرض سے آیا تھا، اس ملاقات میں سب کی مرادیں پوری ہوتے دیکھیں۔ کچھ لوگ خاموش بیٹھے تھے۔ شاید ہجوم میں دل کی بات زبان پر لانے سے گریزاں تھے۔ میں نے کہا، اے دل! اللہ والوں کی مجلس میں احتیاط اور ادب کہ یہاں خیال کی آہٹیں بھی سنی جاتی ہیں۔ دل کے آئینے کو صاف رکھنا تا کہ صاحبِ محفل کی فکر عکس ریز ہو۔

بزرگ نے دارالمطالعہ کی منتظم کی تعریف کی کہ انہوں نے افتتاحی تقریب کے انعقاد کے لئے بہت کام کیا ہے۔ دل بچے کی طرح للچایا کہ کاش یہ شفقت مجھے بھی نصیب ہو۔ یہاں سب ایک دوسرے کے اپنے ہیں اور میں غیر ہوں۔ سلام کر کے اٹھی تو میری طرف اشارہ کر کے انہوں نے حاضرین سے فرمایا، ان کے ابا نے بہت کام کیا ہے۔

حیرت ہوئی کہ میرے ابو نے ایسا کون سا کام کیا ہے جو بزرگ کو معلوم ہے اور گھر والے بے خبر ہیں۔

گھر پہنچ کر ابو سے تذکرہ کیا تو وہ چونک گئے۔

انہوں نے بتایا، ہائیکورٹ کے ہال میں لیکچر کے انعقاد سے تین روز پہلے میں دفتر میں صبح سے شام تک مصنف کا تعارفی نوٹ جو کتاب کی پشت پر موجود تھا، کاغذوں پر اپنے ہاتھ سے لکھتا رہا۔ فوٹو کاپی نہیں کروائی۔ تعارفی نوٹ لے کر وکلا اور جج صاحبان کے دفاتر گیا اور ذاتی طور پر علمی نشست میں شرکت کی دعوت دی۔ پیش نظر جذبہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک آفاقی پیغام پہنچے۔

ابو کی بات سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔ وہ جو کہتے تھے کہ میرا دل کوئی جیت نہ سکا — ملاقات سے قبل روشنی کے ہالے میں بند ہو گئے۔

ابو نے کہا، تمہاری بات سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے

کہ وہ صاحبِ اسرار ہیں کیوں کہ بیٹی! میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔

ان باتوں کے بعد بھی بیعت کی اجازت لینا مشکل تھا۔ اپنی کم فہمی کی بنا پر سوچتی رہی کہ کیا حرج تھا جو وہ مجھے بیعت کر لیتے ۔میری موجودگی میں انہوں نے ایک صاحبہ کو بیعت کیا اور فرمایا— آپ کا راستہ (گھر میں) سب سے الگ ہے۔

ان کے حکم کی وجہ کئی سال بعد سمجھ میں آئی۔ وہ میرے پورے گھر کو روشن لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ جن خاتون سے کہا تھا کہ آپ کا راستہ سب سے الگ ہے، وہ خاتون میری اچھی سہیلی بن گئیں اور آج بھی ان کا راستہ اپنے خاندان میں سب سے الگ ہے۔

بیعت کی شرط پوری کرنے کے لئے چار و ناچار ابو سے بات کی۔ وہ کہنے لگے، کیا ضرورت ہے؟ حالاں کہ ابو ہمارے اکتسابی علوم کے لئے اچھے سے اچھے استاد کا انتخاب کرتے تھے پھر روحانی علوم میں پس و پیش کیوں؟ جب انہیں بتایا کہ بزرگ نے فرمایا ہے والدین کی اجازت سے آؤ تو وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ توقف کے بعد کہا، بیٹی ! یہ بزرگ اللہ کے بندے ہیں۔ انہوں نے تمہیں سیدھی راہ دکھائی ہے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

تیسری ملاقات تھی۔ بھائی کے ہمراہ سمن آباد روانہ ہوئی۔ اس زمانے میں تیز رنگوں سے دل گھبراتا تھا اور زیادہ تر سفید سوتی لباس پہنتی تھی۔ ذہن میں آیا کہ نیا جوڑا پہننا چاہئے۔ نیا سفید جوڑا نہیں تھا— مجبوراً نیلے جوڑے کا انتخاب کیا۔

ملاقات کے وقت بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ گھبرا کر بھائی کو دیکھا، وہ بھی آنسو صاف کر رہا تھا۔

بزرگ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئے:

''بیٹی! ٹھہرے ہوئے پانی میں بدبو ہوتی ہے۔ کوئی چھڑی کی مدد سے ہلائے تو بدبو اڑتی ہے۔ بار بار ہلانے سے بدبو دور ہو جاتی ہے۔ اگر آپ ایک راستے سے گزر رہی ہیں جہاں مردہ کتا پڑا ہے، آپ کیا کریں گی ؟ آپ راستہ نہیں بدلیں گی، ناک پر رومال رکھ کر گزر جائیں گی۔''

الفاظ ذہن میں نقش ہو گئے۔

انہوں نے پوچھا، سونے کا بسکٹ دیکھا ہے؟

بصد احترام عرض کیا، جی دیکھا ہے۔

سونے کا بسکٹ کسی کو ماتھے پر سجاتے دیکھا ہے؟

عرض کیا، جی نہیں۔

کبھی سنار کو زیور بناتے دیکھا ہے؟

جواب نفی میں تھا۔ انہوں نے فرمایا،

''سنار پہلے سونا پگھلاتا ہے۔ آنچ دیتا ہے۔ سنار کے پاس چھوٹی ہتھوڑی ہوتی ہے۔ وہ ہتھوڑی سے ہلکی

ہلکی ضربیں لگاتا ہے اور جھومر بنالیتا ہے جسے ماتھے پر سجایا جاتا ہے۔ روحانیت کوئی آسان کام نہیں ـــ لوہے کے چنے چبانے کا نام ہے۔ جب لوہے کے چنے چبائیں گے تو دانت بھی گریں گے۔''

اشکوں کی بارش تھی۔

آج رونے کی وجہ نہیں پوچھی۔

غور سے دیکھتے ہوئے فرمایا، یہ بھی تربیت ہے کہ آپ سفید پہننا چاہیں، آپ کو نیلا پہنا دیا جائے۔

میں نے تیزی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

انہوں نے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، آپ یہیں ہیں نا ـــ؟ یہ فرما کر اندر تشریف لے گئے۔

رش بڑھ رہا تھا۔ کسی نے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ ہجوم کی وجہ سے دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ آنسو رکنا بھول گئے تھے۔ دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہیں پڑھے ہوئے سنہری الفاظ یاد آئے۔

''ایک در پکڑ اور مضبوط پکڑ اور اپنے پر اس کی دہلیز پر جلا دے۔''

دل سے پکارا ـــ اے میرے پروردگار! صد شکر ہے کہ آپ نے اپنے دوست، اپنے بندے سے ملایا۔ مدت سے روح آپ کی دید کی پیاسی ہے۔ مجھے اپنی راہ میں ثابت قدم رکھ اور منزل آشنا کر دے۔

میں نے اپنے پر اس دہلیز پر جلا دیئے!

یہاں سے سفر کی ابتدا ہے اور انتہا بھی۔

اشک بہہ رہے تھے۔ چپکے چپکے آنسو صاف کرتی رہی کہ کوئی دیکھ نہ لے لیکن مجھے وہاں کون جانتا تھا۔ اندر میں آواز گونجی ـــ تجھے وہ جانتا ہے جس کے لئے تو بے قرار ہے اور تلاش میں یہاں پہنچی ہے۔

رش ختم ہوا ـــ وہ سامنے تشریف فرما تھے۔

دور سے دیکھنے والی نظر بہت قریب محسوس ہوئی۔

ایک خاتون نے میری جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا کہ یہ رونا دھونا تو ٹھیک نہیں۔

فرمایا، رونا دھونا تو حالات کا ہوتا ہے جسے اللہ پسند نہیں کرتے۔ یہ تو گداز ہے اور اللہ کو بہت پسند ہے۔

ہمت بندھی اور میں قریب گئی۔ وہ آگاہ تھے کہ میں والدین کی اجازت سے آئی ہوں۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہمیں بیعت کر لیا۔

وہاں سے اٹھی تو میرے اندر عزم اور یقین تھا۔

باہر آتے ہی بھائی نے پوچھا، کیوں رو رہی تھیں؟

میں نے کہا، تم کیوں رو رہے تھے؟

میری طرح اس کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔

ہم دونوں گلی کے ایک طرف سر جھکائے کھڑے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ یہاں سے جاتے ہوئے ہم وہ نہیں ہیں جو یہاں آنے سے پہلے تھے۔

نظام بدلا تو کلام بھی بدل گیا۔ بیعت کے بعد جو پہلا کلام لکھا اس کے چند اشعار یہ ہیں،

تم کو دلبر بنالیا ہم نے
اپنے مقصد کو پالیا ہم نے
جس کے مکھڑے پر کاروبار چمن
ایسا موسم چرا لیا ہم نے
تیرے بن کچھ نظر نہیں آتا
دل زیاں سے اٹھا لیا ہم نے
خامشی میں سکوں کے پہرے ہیں
شہر کو بن بنالیا ہم نے
اپنے پریتم کی خاکِ پا لے کر
من کا مندر سجالیا ہم نے

ذہنی یکسوئی سے روشنیاں منتقل ہوتی ہیں اور تزکیۂ نفس کی داغ بیل پڑتی ہے۔ نتیجے میں سالک پر سے تساہل پسندی، غفلت، حسد، بغض، کینہ، تکبر اور دیگر ظلمات کے پرت اترتے ہیں یہاں تک کہ قلب کو قلبِ سلیم کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور بندہ شیخ کی طرز فکر میں ڈھل کر اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ پھر طاغوتی طاقتوں سے ڈرتا ہے نہ کسی کے آگے جھکتا ہے۔ عزم و یقین کے راستے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوتی۔

باادب ہونے سے روشن ضمیری، بردباری اور ہمت جیسے قلندرانہ اوصاف نمو پاتے ہیں۔ اور ذہن یکسو ہوجائے تو دل میں انوار و تجلیات موجزن ہوجاتی ہیں جن سے پروازِ فکر عالم ملکوت کی طرف صعود کرتی ہے اور عشق کے سمندر میں فنا کو بقا ملتی ہے۔ ایسے بندے کی ذات مخلوقات کے لئے بے لوث خدمت گار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ذہنی و قلبی رفاقت کے لئے مادی فاصلے حذف ہوجاتے ہیں۔ بندہ جہاں ہو، تصور سے قریب ہوجاتا ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تربیت کے لئے قربت کی کوئی اہمیت نہیں۔ قول زبان زدِ عام ہے:

''اولیاء اللہ کے ساتھ ایک لمحے کا تقرب سو سالہ طاعتِ بے ریا سے افضل ہے۔''

اہلِ دل کہتے ہیں کہ عشق ذکر سے آگے اور ــــ مقام ہے۔ نگاہِ عشق دریائے محبت کی ایک موج ہے جو اللہ کی محبت کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ اگر نسبت مضبوط ہے تو اللہ کے فضل و کرم اور حضور پاکؐ کی رحمت سے سالک وسوسوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ اخلاص اسے راستے سے وابستہ رکھتا ہے ورنہ تعلق خاطر نہیں ہوتا۔ روحانیت میں باریکیاں بہت ہیں۔

یک مو اگر ہل جائے پاؤں
پھر کہیں ٹھور نہ ٹھاؤں

روحانیت شہرِ عشق ہے جس میں فریب کاری کو دخل نہیں۔ اگر فریب ہے تو وہ عشق نہیں۔ فریب ــــ ظاہر کو سب کچھ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے اور ظاہر میں الجھنے والا حقیقت سے دور ہوجاتا ہے۔ (قسط: ۲)

نادیہ افتخار

وقت، رات کا تھا

محض کتابیں دیکھنے یا پڑھنے سے علم منتقل نہیں ہوتا کیوں کہ یہ آنکھ کا دیکھنا ہے۔ بات ذہن کے دیکھنے کی ہے۔ چہرے پر سجی دو آنکھوں کے بجائے ذہن کو آنکھ سمجھنے سے مشاہدہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

تیز بارش ہو رہی تھی۔ پرندے درختوں کی آغوش میں سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ چرند و درند محفوظ پناہ گاہوں اور آدمی اپنی قیام گاہوں میں بارش کے زمین سے ٹکرانے کی آوازیں سن رہے تھے۔ ہر طرف پانی کا شور تھا لیکن شور میں خاموشی سب نے محسوس کی۔ شعور پر رات کے حواس غالب ہونے لگے اور توجہ بارش کی آواز پر یکسو ہو گئی۔ آواز کی شدت بتا رہی تھی کہ پانی کے قطرے کس رفتار سے زمین پر برس رہے ہیں۔ رفتار کم ہو تو شاید یہ زمین تک نہ پہنچ سکیں اور ہوا اڑا کر کہیں اور لے جائے۔ قدرت کے راز انوکھے ہیں۔ قطرے جب تک بادل میں رہتے ہیں، فضا میں معلق ہوتے ہیں اور بادل سے الگ ہوتے ہی زمین کی کشش ان کو کھینچ لیتی ہے۔ بارش کا شور بتا رہا تھا کہ زمین ہر اس چیز کو کھینچتی ہے جس میں انفرادیت ہے۔

— سسکیاں سنائی دیں۔ آس پاس سب بارش کا مزہ لے رہے ہیں، پُرسکون ماحول میں کون رو رہا ہے؟ ٹھنڈے بارانی موسم میں چھت کے نیچے گرم لحاف میں وجود پر کپکپی طاری ہو گئی جب کشف ہوا کہ سسکیاں میلوں میل دور کسی ملک کی سرحد پر بے یارو مددگار ان پناہ گزینوں کی ہیں جو اس کی طرح انسان ہیں مگر چھت کے بغیر، بچوں سمیت، سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے، بھوک پیاس سے نڈھال، انسانی قدروں کے بیدار ہونے کے منتظر ہیں۔

گھر میں نفرت کی آگ اندر باہر ساری چیزیں راکھ کر دیتی ہے۔ پہلے دو افراد لڑتے ہیں، ان میں مصالحت کروانے کے بجائے طرف داری شروع ہوتی ہے اور دو افراد، دو گروہ بن جاتے ہیں۔ پھر نفرت کی آگ کو اور ہوا ملتی ہے اور لڑائی میں پورا معاشرہ شامل ہو جاتا ہے، بات خانہ جنگی تک آ پہنچتی ہے اور آباد شہر کھنڈرات بن جاتے ہیں۔

بارش میں خاموشی اور خاموشی میں شور سے شعور پر

ضرب لگی۔اسے تحفظ اور نعمتیں میسر تھیں۔ وہ اپنے گھر، اپنے ملک میں رہتی تھی، بے گھر ہونے کا ڈر نہیں تھا، کھانا پینا، لباس، تعلیم اور دوسری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں لیکن اس کی زندگی میں شکر کی کمی تھی۔ چند خواہشات پوری نہ ہونے پر وہ روز اللہ سے شکوہ کرتی تھی۔ بارش نے سر پر چھت، حفاظت کے لئے چاردیواری اور ضرورت کے لئے موجود چیزوں کا احساس دلایا۔ بے ساختہ آنسو بہنے لگے — ندامت اور شکر کے آنسو۔ آگہی اسے متنبہ کر رہی تھی کہ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گی؟

آخری کتاب قرآن کریم میں شکر کی تاکید متعدد مقامات پر ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔''

(البقرۃ: ۲۴۳)

افسوس ہوا کہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا اللہ دیدہ نادیدہ وسائل کے ذریعے اپنا فضل فرماتا ہے لیکن میں ناشکری ہوں۔

آنکھیں بند کر کے بارش کی آواز میں گم سوچ رہی تھی کہ زمین سے آسمان تک ہر مخلوق ایک دوسرے کی خدمت پر مامور ہے۔ سورج خدمت سے منہ موڑ لے تو زمین تاریک ہو جائے گی، بیج بند رہے گا، فصلیں نہیں ہوں گی، وہ جراثیم جو سورج کی شعاعوں سے ختم ہوتے ہیں، ان کی افزائش سے بیماریاں بڑھ جائیں گی، بارشوں کا سلسلہ رک جائے گا وغیرہ۔

نعمتوں کی عدم دستیابی کے نتائج کا تصور کیا۔ ان کی دستیابی میں ہمارا کوئی حصہ نہیں، ساری نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں پھر میں شکر سے دور کیوں ہوں—؟

وسائل کی قدر کرنے سے شکر ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ شکر یہ ہے کہ نعمتیں اور صلاحیتیں اپنے اور دوسروں کے استعمال میں لائی جائیں۔ نعمتیں اپنی ذات تک محدود رکھنا اور اندر موجود صلاحیتوں سے ناواقفیت ناشکری ہے۔

''ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے سامانِ زیست فراہم کیا مگر تم لوگ کم شکر گزار ہوتے ہو۔'' (الاعراف: ۱۰)

جیسے سخت گرمی میں ٹھنڈے جھونکے یا سردی میں آگ کے گرد دائرہ بنا کر تپش محسوس کرنے سے راحت ملتی ہے، اسی طور شکر گزاری ایسا تحفہ ہے جو اظہارِ ممنونیت کی خواہش بڑھا دیتا ہے، سرور کی لہریں جسم میں سرایت کرتی ہیں اور انگ انگ مسرور ہو جاتا ہے۔ شکر زبان سے ادا کئے جانے والے لفظوں کا نام نہیں جو ہم اکثر کہتے اور سنتے ہیں۔ یہ قلبی کیفیت ہے جس میں محسوسات لطیف ہونے

سے غیب ظاہر کا مشاہدہ ہوتا ہے اور قلب رب کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔

تفکر سے شکر ادا کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

''وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا ہے تاکہ تم تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔'' (النحل:۱۴)

''اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکا یک وہ پھبک* اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات ظاہر کرنا شروع کیں۔'' (الحج: ۵)

آیات پر تفکر سے مفہوم روشن ہوا کہ دیکھنے سے مراد ارتکازِ توجہ ہے۔ بک شیلف میں کتابیں رکھی ہیں، محض کتابیں دیکھنے یا پڑھنے سے علم منتقل نہیں ہوتا کیوں کہ یہ آنکھ کا دیکھنا ہے۔ بات ذہن کے دیکھنے کی ہے۔ چہرے پر بجی دو آنکھوں کے بجائے ذہن کو آنکھ سمجھنے سے مشاہدہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

سطر پڑھنے سے ذہن نہیں کھلتا، سطر پر غور کرنے سے کھلتا ہے۔ پڑھی ہوئی کتاب کچھ عرصے بعد دوبارہ پڑھیں تو بہت سی چیزیں ملتی ہیں جو پہلے توجہ میں نہیں آئیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ جملہ پہلے کہاں تھا؟

بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ اصل پڑھنا، توجہ سے پڑھنا ہے۔ اللہ نے سطحی طور پر دیکھنے کی نفی کی ہے۔ بار بار فرمایا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے، کیا تم نہیں سنتے، تم سوچتے کیوں نہیں؟

① کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟

② آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟

③ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کیسے جمائے گئے؟

④ زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟

کلامِ الٰہی کے مطابق توجہ اصل دیکھنا ہے۔ بارش اس سے کہہ رہی تھی کہ جب تم اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوگی پھر شکر گزاری کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا!

ساڑھے سات ارب خواتین وحضرات میں تقریباً ہر شخص ناخوش ہے اور ناخوشی کی وجہ ناشکری ہے۔ ناشکری مایوسی اور ذہنی تناؤ پیدا کر کے نفسیاتی، اخلاقی اور جسمانی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔

''اے آل داؤدؑ! عمل کرو شکر کے طریقے پر۔ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہیں۔'' (سبا:۱۳)

اللہ نے شکر ادا کرنے کی توفیق سب کو دی ہے اور راستہ دکھایا ہے۔ راستے پر چلنا بندوں کا کام ہے۔

---

* پھبک (سرسبز وشاداب ہونا)

نشانِ راہ ملنے کے بعد بھی کوئی نہ چلے تو نقصان اپنا ہی ہے۔ اللہ مخلوق سے محبت کرتا ہے لیکن اللہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔

محترم عظیمی صاحب واقعہ سناتے ہیں:

''لندن میں قیام کے دوران خیال آیا کہ معلوم کروں کہ محققین نے جسم کی ہڈیاں اور اعضا بنا لئے ہیں، ان کی قیمت کیا ہے۔ چارٹ (جدول) لیا اور اعضا کی قیمت معلوم کی کہ اس ہڈی کی کیا قیمت ہے؟ گھٹنے کی ہڈی، گردن کے مہرے کی کیا قیمت ہے؟ کمر کے مہروں کی کیا قیمت ہے؟ پاکستانی کرنسی کے مطابق حساب ڈھائی کروڑ روپے بنا۔ آدمی جس اسٹرکچر پر، جن ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھڑا ہے، ان ہڈیوں (جو سائنس نے پلاسٹک اور دوسرے مسالے سے بنائی ہیں) کی قیمت ڈھائی کروڑ روپے ہے۔ پھر آپریشن کے بارے میں معلومات حاصل کیں کہ دماغ کے آپریشن کے کتنے پیسے ہوئے؟ دل کے آپریشن کے کتنے پیسے ہوئے؟ 92 لاکھ روپے بنے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہر شخص جو دنیا میں آباد ہے، ہر روز اللہ تعالیٰ کے تین کروڑ روپے خرچ کرتا ہے اور اس کے پاس اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے زبان گنگ ہے۔ اس سے زیادہ بے حسی کیا ہو سکتی ہے! اس سے زیادہ کفرانِ نعمت کیا ہو سکتا ہے! اس سے زیادہ ناشکری کیا ہو سکتی ہے!''

واضح رہے کہ مذکورہ تحقیق دو دہائی پہلے کی ہے۔ اعضا کی قیمت آج ہزاروں گنا بڑھ چکی ہے۔

~~~~~~

شکر کی عادت اپنانے کے لئے روحانی استاد نے اسے مشق دی۔ حکم پر عمل کرتے ہوئے اللہ کی نعمتیں لکھنا شروع کیں، ہاتھ تھک گیا، قلم نہیں رکا۔ اگلے روز بھی یہی صورت رہی۔ روزانہ نعمتیں لکھنے سے ناشکری دور ہو گئی۔

روحانی استاد گراں قدر نعمت ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔ ایسی ہستیاں لاکھوں میں ایک ہیں جن کی محفل میں دنیا بے معنی ہو جاتی ہے، صرف اللہ سے محبت کا خیال محیط ہوتا ہے۔ روحانی استاد جن کو مل جائے، وہ خوش قسمت ہیں۔

بارش ہو رہی تھی اور وہ خیالات کی رو میں شعور کے کئی مراحل طے کر چکی تھی۔ تفکر اور تجربے نے سکھایا کہ اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے والے لوگ شکر کے مقام تک پہنچتے ہیں۔ دعا کی،

''یا اللہ! مجھے اور ہم سب کو شکر کے راستے پر قائم رکھ اور اپنی راہیں ہمارے لئے کھول دے۔ جو بہن بھائی، بچے بوڑھے ہماری غفلت، خودغرضی اور نفسانفسی کی وجہ سے دربدر ہیں، انہیں سائبان عطا کر۔ سب کو ایسا استاد عطا فرما جو آپ کے حکم کے مطابق عمل کرے، آمین۔''

~~~~~~

ڈاکٹر نعیم ظفر

سوچ میں سوچ

سائنس سے دلچسپی رکھنے والے خواتین وحضرات 'سوچ میں سوچ' مضمون سائنسی نقطۂ نظر سے پڑھیں اور اپنے خیالات لکھ کر ادارہ کو بھیجیں۔ بہت شکریہ۔ آپ کا دوست 'ماہنامہ قلندر شعور'

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: مظاہر خیالات کا عکس ہیں۔ خیال شبیہ در شبیہ باطن پر وارد ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن کلاک وائز سوچتا ہے، اینٹی کلاک وائز سوچنے کا عادی نہیں۔ خیالات کا سورس کیا ہے، کہاں سے آتے ہیں اور ان میں موجود شبیہوں کا مظاہرہ کیسے ہوتا ہے، وہ اس بارے میں نہیں سوچتا۔ دنیا میں سارا سفر سوچ اور سوچ کے درمیان ہے۔ محققین ایسی دنیا بنانے میں کوشاں ہیں جہاں زمان ومکان کی قید نہ ہو جب کہ ایسی دنیا ہمارے داخل میں موجود ہے۔ بتایئے وہ کون سا زاویۂ فکر ہے جو لمحے میں فاصلے کی قید سے آزاد کر سکتا ہے؟

تحقیق وتلاش — سوچ کا مادی مظاہرہ ہے۔

سائنس کے تین بڑے شعبے بتائے جاتے ہیں۔

۱۔علمِ ریاضی ۲۔مظاہرِ فطرت ۳۔علمِ عمرانیات

خیال کا مادی مظاہرہ (ایجادات) شعور کی وسعت سے منسلک ہے۔ شعور — شہود کا ایک زاویہ ہے۔ شہود کے لاتعداد زاویے ہیں۔ جس درجے سے آدمی واقف ہے، وہ درجہ مادیت میں فعال ہے۔

اس وقت لگ بھگ مادی علوم کے ساڑھے چھ سو شعبے ہیں۔ تحقیق وتلاش صرف ایسے شہود سے واقف ہے جو مادے کی چار حالتوں میں مقید ہے جن کو ٹھوس، مائع، گیس اور پلازما کہا جاتا ہے۔ پلازما گیس کے لطیف وکثیف سائے ہیں۔ آدمی مظاہر سے وقوف کے لئے صرف پانچ بنیادی حواس استعمال کرتا ہے اور وہ بھی محدود طرزوں میں۔ دیگر حواس سے وہ لاعلم ہے۔

وقت کے ساتھ سوچ میں گہرائی سے ایسے عوامل کی نشان دہی ہوئی جن کا احاطہ معلوم حواس سے ممکن نہیں تھا جیسے کھانسی، نزلہ اور زکام کے پس پردہ فعال نامعلوم وائرس وغیرہ۔ نامعلوم عوامل جاننے کے لئے مادی اشیا کا سہارا لیا گیا جیسے عدسہ، بالائے بنفشی شعاعیں، زیریں سرخ شعاعیں، الٹرا ساؤنڈ، برقی و مقناطیسی شعاعیں اور ایکس رے شعاعیں وغیرہ۔ دیکھا جائے تو حواس پر مادی حواس کا ماسک پہن لیا گیا ہے۔ بتایئے مشاہدے کی ایسی طرزوں سے

دیکھنے کی صلاحیت میں کیا فرق رونما ہوگا؟

مثال: سورج کی عام روشنی کو ہم یک رنگ دیکھتے ہیں جب کہ پرزم اسے سات رنگوں میں دکھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر پرزم کی نظر آدمی کی نظر کو سات رنگوں میں تقسیم کر دیتی ہے جس سے یقین منتشر ہوتا ہے۔ یقین کی ٹوٹ پھوٹ سے جو دنیا مظہر بنتی ہے وہ ہمارے شعور کا حاصل ہے — شعور کی یہ طرزِ تفہیم بے یقینی اور دھوکا ہے۔

روشنی کی حقیقت کیا ہے؟ روشنی پرزم سے ٹکرانے سے پہلے یک رنگ ہے۔ یک رنگی کا کثیر رنگوں میں نظر آنا شکوک وشبہات اور مفروضوں کے علاوہ کیا علم دے سکتا ہے!

صاحبِ مشاہدہ ہستیاں بتاتی ہیں کہ نظر آسمان پر کل 10 ہزار ستاروں کا مشاہدہ کر سکی ہے۔ سوال ذہن میں آتا ہے کہ دیوقامت دوربینیں لاکھوں اربوں کی تعداد میں ستارے کیوں بتاتی ہیں —؟

یاد رہے کہ ماہرین کی ظاہری نظر نے مشاہدے کے لئے درجہ بدرجہ عدسے اور آئینے کی کئی تہوں کا ماسک (دوربین) لگا رکھا ہے۔ قوسِ قزح ہمیں بنفشی وسرخ رنگوں کے کئی شیڈ دکھاتا ہے جب کہ یہ سارے رنگ سورج کی یک رنگ کرن ہیں۔ ہوسکتا ہے فضا میں اس طرح کے لاکھوں پرزم موجود ہوں جو ہمہ وقت ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دریافت کئے جانے والے نئے ستارے اور کہکشائیں محض پرزم کی بدلتی ہوئی ماہیت کی کارستانی ہو۔ ماہرینِ فلکیات سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اپنی تحقیقات ادارہ کو بھیجیں۔ ادارہ مشکور ہوگا۔

پرزم کے حوالے سے کائنات میں شہود کی کئی طرزوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً عدسے کا شہود، آئینے کا شہود، ماحولیاتی روشنی کا شہود، پرت در پرت منقسم فضا کا شہود۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ شہود کی یہ تمام طرزیں دراصل مادے کی مختلف کثافتیں ہیں۔

شیر کی آنکھ زرافہ کو چھوٹا دیکھتی ہے، آدمی اسے 16 سے 20 فٹ بلند دیکھتا ہے۔ سورج مکھی کا پھول ہمیں پیلے رنگ میں نظر آتا ہے جب کہ ماہرین کا کہنا ہے کہ بھونرے کی آنکھ اسے جامنی، اور مویشی بھورے رنگ میں دیکھتے ہیں۔

واضح ہوتا ہے کہ ہمارا دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، سونگھنا اور سمجھنا محض طرزِ کلام ہے، اس کا حقیقت سے تعلق نہیں۔ ہم جن حواس کو استعمال کرتے ہیں ان کے اجزائے ترکیب خارجی مادے ہیں۔ ہمارا علمِ حسیات ان ہی خارجی مادوں سے مرکب ہے۔

یہ سوچ کے ظاہری رخ کا ذکر ہے۔

سوچ کے داخلی شہود کا محلِ وقوع کیا ہے اور اس کا حقیقت سے کیا تعلق ہے؟

سوچ کا تسلسل نہیں رکتا۔ حالات و کیفیات کیسی ہی کیوں نہ ہوں — 'سوچ' کے گہرے جسمانی اور نفسیاتی نقوش بنتے ہیں۔ کتنے واقعات ہیں جب خواب میں ٹینشن یا مایوسی کی شدت سے بلڈ پریشر low ہو جاتا ہے، شوگر بڑھ جاتی ہے حتیٰ کہ ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ داخلی سوچ کا خارجی جسم سے گہرا رشتہ کس فارمولے کے تحت قائم ہے —؟

ایسا وقت بھی آتا ہے جب جسم میں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے جیسے کہ موت اور نیند۔ خواب میں جسم بے حرکت ہوتا ہے۔ خوف ناک منظر دیکھ کر آنکھ کھلتی ہے، جسم پسینے میں شرابور ہوتا ہے اور حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ آخر ایسا کیوں ہے —؟

فرد — سوچ ہے اور سوچ دماغ میں متحرک ہوتی ہے۔ دماغ کی بظاہر اندھیر کوٹھڑی میں نظر تنہا دکھائی دیتی ہے، وہاں بہت سے عوامل متحرک ہیں۔ سب کے دماغ کی اپنی انفرادیت ہے۔ ایسی انفرادیت جو فرد سے فرد اور نوع سے نوع میں الگ ہے۔

انفرادیت کے باوجود، نوعوں کے مشاہدات و تجربات میں اشتراک ہے۔ حشرات، پرندے، درخت، مٹی، بیل، ہوا اور آدمی پانی کو پانی سمجھ کر پیاس بجھاتے ہیں۔ بارش میں ہماری طرح چہکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انفرادیت کے باوجود افرادِ کائنات ایک ایکو سسٹم کے تحت کیسے منسلک ہیں اور وہ کون سا رشتہ ہے جس نے ان کو یکجا رکھا ہے؟

درج ذیل آیات میں نوعوں کے افعال میں توازن قائم کرنے والے عناصر کی وضاحت ہے۔

۱۔ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ کے ہیں، اور اللہ غالب (عزیز) اور حکمت والا (حکیم) ہے۔
(الفتح: ۷)

اللہ — کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں رہنے والی معلوم اور نامعلوم مخلوقات کا خالق ہے۔ اگر 'عزیز' اور 'حکیم' کی صفات پر غور کریں تو تخلیقی فارمولوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوچ کا لطیف ترین طرزِ شہود ہے۔ اس طرز کی مثال مضمون کی دوسری قسط میں سورہ لقمٰن کی آیت ۲۷ میں ہے۔

کائنات کی ساخت کے بارے میں سوچ کی شہودی طرز کا ایک اشارہ اس آیت میں ہے۔

۲۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا۔ وہ رحمٰن ہے، اس کا حال کسی باخبر سے پوچھ۔ (الفرقان: ۵۹)

یہاں رحمٰن کی صفات بیان کی گئی ہیں اور ان صفات کے علم کے لئے صاحبِ مشاہدہ خواتین و

حضرات سے رجوع کرنے کا حکم ہے۔

شہود کی طرزوں کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ غور وفکر اور شکر ہے۔

۳۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔ یہ باتیں اس شخص کے لئے ہیں جو غور کرنا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے۔

(الفرقان: ۶۲)

آیت میں شہود کی دو طرزوں رات اور دن کے غالب ومغلوب ہونے کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ کوانٹم طبیعیات کے ماہرین نے اس طرزِ تصور کو پیچیدہ کر کے پیش کیا ہے۔

تنگ نظری دیکھئے کہ نوعِ آدم تمام مخلوقات کی مشاہداتی طرزوں کو خود سے کم تر جانتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پرندے کو اڑتا دیکھ کر آدمی میں اڑنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ محدود ذہن نے اندر سے ملنے والی انسپائریشن کی تکمیل میں کئی تجربات کئے مگر لامحدود کو محدود نظر سے تلاش کیا۔ بوئنگ 707 تقریباً ساڑھے پانچ سو مسافروں کو ہوا میں لے کر اڑ سکتا ہے لیکن آدمی کے اڑنے کا تاحال کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نینو ٹیکنالوجی میں ترقی کے باوجود ایسا کوئی ڈرون نما پرندہ اور کیڑا سامنے نہیں آیا جو چند باجرے کے دانے چن کر گھنٹوں تک بلندی میں پرواز کر سکے۔

ہم پانچ حواس سے محدود کام لے کر ان میں سے کسی حس کے ذریعے احساسات ریکارڈ کرتے ہیں۔ اطراف میں نگاہ ڈالئے — گھاس پھوس، پودے، درخت، قطار در قطار گاڑیاں، آتے جاتے لوگ، اونچے فلیٹ، تاروں پر بیٹھے پرندے اور فضا میں پانی کے مشکیزے نظر آتے ہیں۔ مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ، بارش کی ٹپ ٹپ، جانوروں کی آوازیں، مشینوں کی تھرتھراہٹ، گاڑیوں کا شور اور بچوں کا کھیل کود۔ ان کو دیکھنے اور سننے کے لئے بصارت اور سماعت کے علاوہ سونگھنے، چھونے اور بولنے کی حسیات بھی فعال ہوتی ہیں۔ جیسے فون پر بات کرتے وقت آس پاس لوگوں کی آوازیں سنتے ہیں، زبان حرکت میں ہوتی ہے، کمرے میں اشیا دکھائی دیتی ہیں۔ انگلیوں کو فون کی گرمائش کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سارے مشاہدات پانچ حواس کی اجتماعیت ہیں جس میں توجہ کا دخل ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کان، آنکھ اور ناک فعال ہیں مگر سنائی اور دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل ہم خارج سے موصول ہونے والی اطلاعات کو حواس کی یکجائی میں ریکارڈ کرتے ہیں۔

مظاہر کو سمجھنے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو حواس پر منعکس ہوتے ہیں؟ مختصر یہ کہ حواس کی یکجائی کے ریکارڈ کی یہ طرزِ شہود (دیکھنا)

کہلاتی ہے اور یہ صرف ایک طرزِ شہود ہے۔

شہود کے ان گنت درجات ہیں۔ چند طرزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ فی زمانہ ہماری زمین پر نوعِ آدم کی تعداد تقریباً ساڑھے سات ارب بتائی جاتی ہے۔ آدم کے ہر فرد کی شعوری سطح مختلف ہے۔ زمین کے اندر اور باہر گمان سے زیادہ مخلوقات ہیں۔ ان میں معدنیات، پانی، تہ در تہ چٹانیں، آتش فشاں، پتھریلے پہاڑ، گلیشیئر، سمندر، بحری و بری پودے اور جانور، جڑیں، درخت، اڑنے اور رینگنے والے حشرات، چرند و پرند اور دیدہ نادیدہ ساری مخلوقات شامل ہیں۔ یہ ارضی مخلوقات کا ذکر ہے، آسمانی مخلوقات اس کے علاوہ، اور بیان سے کہیں زیادہ ہیں۔

ہدہد کی نظر زمین میں کئی سو فٹ گہرائی میں پانی تلاش کر لیتی ہے۔ باز کو میلوں بلندی سے زمین پر دوڑتا ہوا خرگوش قریب نظر آتا ہے۔ کتے کی ناک کئی دن گزرنے کے باوجود پگڈنڈیوں اور جھاڑیوں میں بو سونگھ لیتی ہے۔ شارک مچھلی فاصلے سے خون کی بو محسوس کر لیتی ہے۔ بلّی اور الّو رات میں ایسے دیکھتے ہیں جیسے آدمی دن میں۔ سمندر کی گہرائی میں آباد ٹرانسپیرنٹ مخلوق میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ شہود کی وہ طرزیں ہیں جن کا احاطہ آدمی کسی نہ کسی طرح محدود حواس میں کر سکتا ہے۔

چشمہ، خوردبین، دوربین، سماعتی آلات، ویڈیو کیمرا، ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹ، زیرِ زمین الٹرا ساؤنڈ اسکین وغیرہ آدمی کے حواس کی مصنوعی ذرّیات ہیں۔ بظاہر ہر شے میں تغیر ہے لیکن گہرائی میں تفکر سے نظر آتا ہے کہ تغیر نہیں ہے۔ آدمی کا معلوم شہود (نظر) پہلے ہی محدود ہے۔ پابند شہود نے حقائق جاننے کے لئے مادی آلات کی پابندی کا ایک اور ماسک پہن لیا ہے۔ پرزم کی مثال دی گئی ہے کہ روشنی ایک رنگ کے بجائے سات رنگوں میں نظر آتی ہے۔ ان طرزوں میں پرزم کا ثقل، آدمی کی نظر پر حاوی ہونے سے یقین ٹوٹ کر سات ٹکڑوں میں بکھر گیا ہے۔ ایسی شہودی طرزوں سے حاصل ہونے والا علم اصل سے قریب ہے یا—؟

جب تجسس نے فطرت کے مطابق ظاہر کو سمجھنے کے لئے اندر رجوع کیا تو حقیقت تک نہ پہنچ سکا کیوں کہ وہ داخلی طرزوں سے ناواقف تھا۔ لہٰذا اس نے تجسس کو ظاہر میں تلاش کیا۔

خارج میں سب مٹی کی شکلیں ہیں جو ماہیت میں محدود ہیں۔ آدمی نے مٹی میں ترقی کی۔ اس ترقی کے کئی ابواب ہیں جن میں پتھر کا دور، لوہے کا دور، تانبے کا دور، میکانکی و حرکی دور اور فی زمانہ سلیکان (ریت) کا دور شامل ہے۔ (قسط:۳)

سید اسد علی

فرشتے

اگر فرشتوں میں مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے اوپر آ جائیں تو مثبت کیفیات کے زور پر وہ انسان کے روپ میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور منفی دخان کی مدد سے جنات کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

سمندر کی سطح سب دیکھتے ہیں، اندر اترنے والے لوگ کم ہیں۔ کائنات بھی سمندر کی طرح ہے جس کی سطح سے ہم واقف ہیں لیکن اندر موجود دنیاؤں کا علم نہیں۔ کائناتی نظام میں انسان کے علاوہ جنات اور فرشتے معاون ہیں۔ یہ دونوں مخلوقات ہمیں دیکھتی ہیں، ہم ان کو نہیں دیکھتے لیکن ہماری ہی نوع میں مقرب بارگاہ بندے جنات اور فرشتوں کو دیکھتے ہیں۔ جو لوگ جنات اور فرشتوں کو نہیں دیکھتے ان کی مثال اس پرندے کی ہے جو سطح آب پر سے پانی پی کر اڑ جاتا ہے مگر زیر آب سمندر کا علم نہیں رکھتا۔

جنات کے بارے میں قیاس آرائی کی جاتی ہے مگر ہر آن خدمت پر مامور بے لوث مخلوق ملائکہ کے متعلق آدمی کم سوچتا ہے۔ الہامی کتابوں میں فرشتوں کی ساخت اور صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ نورانی مخلوق ہیں۔ ان کی ذمہ داری پیغام رسانی ہے۔

''رسول اس پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی، ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

(البقرۃ: ۲۸۵)

ایمان یقین ہے اور یقین کی تکمیل مشاہدے سے ہوتی ہے۔ انبیائے کرام کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کے لئے حجاب اٹھ جاتے ہیں اور فرشتوں کی دنیا کے معمولات ان پر روشن ہوتے ہیں۔

رسول اللہؐ سے ایک صحابی نے اپنی شب بیداری کا تذکرہ کیا کہ میں آسمانوں میں ملائکہ کو چلتے پھرتے دیکھتا تھا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، اگر تم شب بیداری کو قائم رکھتے تو فرشتے تم سے مصافحہ بھی کرتے۔

ملائکہ معصوم اور نورانی مخلوق ہیں۔ نوعِ آدم میں بناوٹ سے پاک لوگوں کو عام طور پر ملائکہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جیسا کہ مصر کی عورتوں نے حضرت یوسفؑ بارے میں خیال ظاہر کیا۔

''جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ

گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔ اور بے ساختہ پکار اٹھیں، حاشا للہ! یہ شخص انسان نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔'' (یوسف:۳۱)

ملائکہ کی ساخت سے متعلق ارشاد ہے:

'' اللہ کے لئے تمام تعریفیں ہیں جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے۔ فرشتوں کے دو دو، تین تین، چار چار پَر ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے، اضافہ کرتا ہے۔'' (فاطر:۱)

دو، تین اور چار پروں سے مراد صفات ہیں۔

یعنی ملائکہ میں صفات اور ذمہ داری کے لحاظ سے درجہ بندی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت زمین پر ساڑھے سات ارب آدمی ہیں۔ اس حساب سے صرف نوعِ آدم کی خدمت پر کھربوں فرشتے مامور ہیں۔ زمین پر دیگر نوعیں بھی آباد ہیں، ان کے ساتھ بھی فرشتے کام کرتے ہیں۔ ایسے میں فرشتوں کی تعداد معلوم کی جائے تو شماریات سے باہر ہے۔ یہ صرف ایک زمین کی بات ہے جس پر ہم رہتے ہیں، عالمین اور نظام لاشمار ہیں۔ اس قدر وسیع نظام میں آدمی کی شماریات سے زیادہ فرشتے کس طرح خدمات انجام دیتے ہیں، سوچ کر عقل گنگ ہو جاتی ہے۔

کائنات میں ہر آن لاتعداد اور لامحدود تحریکات ہوتی ہیں۔ ہر حرکت کے پیچھے ذہن اور شعور کام کرتا ہے۔ ان میں سے بیش تر تحریکات میں ہمارا ارادہ کام نہیں کرتا۔ مثلاً سانس لینا، دل دھڑکنا، خون دور کرنا، کھانا ہضم ہونا اور بے شمار کیمیائی عوامل وغیرہ۔ فطرت کا مطالعہ کیا جائے تو بارش، آتش فشاں، زلزلہ، ہوا، سورج، چاند، تہ در تہ زمین کا نظام اور دیگر عوامل پر مخلوق کا ارادہ و اختیار نہیں ـــــ حرکت کا یہ میکانزم اللہ کے حکم سے ملائکہ کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

''ایک روز حضور قلندر بابا اولیاؒ نے فرمایا، آج میں نے گرومندر پر چند فرشتے دیکھے۔ ان سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، کچھ دیر بعد حادثہ ہونے والا ہے۔ جن لوگوں کی موت کا ابھی وقت نہیں آیا ہمیں ان کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے۔ اگلی صبح اخبار آیا تو حادثے کی تفصیلات اسی طرح درج تھیں جس طرح قلندر بابا اولیاؒ نے بیان کی تھیں۔''

(کتاب: تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ)

اللہ تعالیٰ نے کائنات انسان کے لئے مسخر کی ہے۔ کائناتی امور میں احکامات کی برآری ملائکہ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ آدمی اپنا ازلی شرف 'احسن تقویم' حاصل کر کے انسان کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو فرشتے اس کے ماتحت کر دیئے جاتے ہیں۔ محترم عظیمی صاحب ذاتی مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

''اکثر رات کو ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ کی کمر دباتے وقت دیکھتا تھا کہ چھت اور دیواروں میں سے دودھیا رنگ کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اندھیرے میں روشنی اچانک نمودار ہوتی تو بعض اوقات سخت خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

ایک رات اتنا خوف زدہ ہوا کہ جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ بابا جی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور فرمایا، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ مردانِ غیب ہیں۔ پھر یہ بات تقریباً روزانہ کا مشاہدہ بن گئی کہ حضور بابا صاحبؒ لیٹے ہوئے ہیں، میں کمر دبا رہا ہوں اور کوئی صاحب ان کے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے۔

اکثر یہ بھی دیکھا کہ یکا یک چکا چوند روشنی ہوئی اور کوئی فرشتہ حضور قلندر باباؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے کچھ ہدایات دیں اور وہ چلا گیا۔''

انبیائے کرام کے روحانی علوم کے وارث اولیاء اللہ نے فرشتوں کی قسمیں بیان کی ہیں، مختصر تفصیل پڑھیے۔

ملائکہ نورانی: کائنات کے مجموعی تقاضوں کے مطابق نظام چلانا ان کی ڈیوٹی ہے۔

ملاء اعلیٰ: یہ پہلی قسم کے فرشتوں سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کا مقام وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوتا ہے۔ ابدالِ حق فرماتے ہیں،

''عالمِ نور سے فروتر ملائکہ مقربین یا ملاء اعلیٰ کی حدود ہیں۔ ان میں ملاء اعلیٰ چھ بازو والے فرشتے ہیں۔ ان کو عالمِ نور کی فراست حاصل ہے اور یہ عالمِ نور کے پیغامات کا تحمل رکھتے ہیں۔

عالمِ نور کے احکامات وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ عرش اعظم سے نافذ فرماتے ہیں۔''

ملائکہ لوحِ محفوظ: مقرب ملائکہ کی پرواز سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے نیچے ایک اور بلندی ہے جس کی وسعتوں کو بیت المعمور کہتے ہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ اور بیت المعمور کی حد میں پرواز کرنے والے فرشتے تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔

ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول ہے۔

دوسرا گروہ اللہ تعالیٰ کے احکام عالم تک پہنچاتا ہے اور تیسرا گروہ ان فرشتوں کا ہے جو عالمِ امر سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنے حافظے میں رکھتا ہے۔ تینوں گروہوں کا تعلق لوحِ محفوظ سے ہے۔

حضیرۃ القدس: جس مقام پر نیک روحوں اور ملائکہ کا اجتماع ہوتا ہے، وہ حضیرۃ القدس ہے۔ یہ مخلوق کو مصیبت سے بچانے کے طریقوں پر سوچ بچار کرتے ہیں اور یہ طریقے لوگوں کو انسپائر کرتے ہیں۔

''وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ وہ تمہیں اندھیرے سے نور میں لائے اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔'' (الاحزاب:۴۳)

ملائکہ اسفل: جو پیغام ملتا ہے، یہ اس سے زیادہ نہیں جانتے۔

ملائکہ سماوی: ملائکہ عنصری کو حکمِ الٰہی پہنچاتے ہیں۔

ملائکہ عنصری: پیغامِ الٰہی مخلوق کو انسپائر کرتے ہیں۔ اگر دو جماعتوں میں لڑائی ہو جاتی ہے تو یہ حالات کے مطابق ایک جماعت کے دل میں بہادری، ثابت قدمی اور فتح کا جذبہ پیدا کر کے ان کی مدد کرتے ہیں اور دوسری جماعت کو بزدلی کے خیالات بھیجتے ہیں تا کہ جو جماعت حق پر ہے، وہ غالب آ جائے۔

کراماً کاتبین: نیکی اور بدی ریکارڈ کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انتظامی امور کے حوالے سے ملائکہ چار گروہ میں تقسیم ہیں۔

۱۔ حضرت جبرئیلؑ کا وصف وحی پہنچانا ہے۔

۲۔ حضرت میکائیلؑ کے فرائض میں بارش کا نظام ہے۔

۳۔ حضرت عزرائیلؑ روح قبض کرتے ہیں۔

۴۔ حضرت اسرافیلؑ کے ذمہ قیامت کے امور ہیں۔

دیگر مذاہب میں تفصیل اس طرح ہے:

★ عیسائی مذہب میں فرشتوں کے نام جبرئیل، میکائیل، رافعیل، ارئیل، ارفعیل وغیرہ ہیں۔

★ یہودی انسائیکلو پیڈیا میں فرشتوں اور ان کے ذمہ مختلف کاموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

میکائیل: رحم کا فرشتہ ہے۔

جبرئیل: انصاف اور طاقت کا فرشتہ ہے۔

رافعیل: تسلی دینے اور زخم مندمل کرنے پر مامور ہے۔

اریل: تقدیر کا فرشتہ ہے۔

سرافیم: جنت کا محافظ و نگہبان فرشتہ ہے۔

ملک الموت: موت کا فرشتہ ہے۔

ہاستان: روز جزا میں حساب پیش کرنے والا فرشتہ ہے۔

ہارکوڈش: عذاب کا فرشتہ ہے۔

اوفانیم: ستاروں کا فرشتہ ہے۔

★ زرتشت مذہب کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرشتے مختلف ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں۔ ہر آدمی کے لئے ایک محافظ فرشتہ ہے جس کا نام فراوشی ہے۔ وہ ان کی حفاظت اور راہ نمائی کرتا ہے، مصیبت میں کام آتا ہے اور عظیم الشان کائنات چلانے میں مختلف امور انجام دیتا ہے۔ ان کی مذہبی کتاب میں ہے:

''فرشتے کلامِ الٰہی پیغمبر کے دل پر نازل کرتے ہیں۔''

(کتاب: وساتیر، ص: ۳۷)

★ سکھ مت کے بانی بابا گرونانک نے اپنی مذہبی تعلیمات میں دو فرشتوں کا ذکر کیا ہے جو آدمیوں کے اعمال کا حساب رکھتے ہیں۔

۱۔ چتر فرشتے ظاہری اعمال لکھتے ہیں۔

۲۔ گپت فرشتے باطنی اعمال (نیت) لکھتے ہیں۔

★ ہندومت میں فرشتوں کو دیوتا مانا جاتا ہے کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے آسمانوں میں رہتے ہیں اور آدمی کے اعمال، خیالات اور نیتوں کا ریکارڈ رکھتے ہیں، اور کائناتی امور چلاتے ہیں۔

فرشتے کائنات کے انتظامی امور میں معاون کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے ہیں اور مخلوق کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے بشارتیں دی جاتی ہیں اور خبردار بھی کیا جاتا ہے۔

ایک مثال جنگِ بدر ہے۔

''اے نبیؐ! یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے، 'کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے'۔ بے شک اگر تم صبر کرو اور اللہ کے لئے تقویٰ اختیار کرو تو جس آن دشمن تم پر چڑھ کر آئیں گے، اسی آن تمہارا رب پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔'' (آل عمران: ۱۲۴۔۱۲۵)

ملائکہ کے ذریعے تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی مثال وحی ہے۔ حضور پاکؐ پہلی وحی کے وقت غارِ حرا میں تھے۔ حضرت جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور اللہ کا پیغام پہنچایا—اقراء!

انبیائے کرام تک وحی پہنچانے کے علاوہ قرآن کریم میں ایک واقعہ ہاروت ماروت کا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد ان کی قوم میں جنات شیاطین لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو فرشتے ہاروت اور ماروت نازل کئے گئے جنہوں نے لوگوں کو سفلی علوم کی حقیقت سے آگاہ کیا اور تخلیقی فارمولوں کی تعلیم دی۔

جب کسی شہر کے معاشی حالات ابتر ہوں اور قدرت اس شہر کو آباد رکھنا چاہتی ہو تو فرشتوں کو وہاں بھیجتی ہے۔ قلندر غوث علی شاہؒ نے واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک شہر میں کساد بازاری کی وجہ سے معاشی حالات خراب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں دو فرشتے بھیجے۔ انہوں نے خریداری کی اور سات دن میں شہر کی رونق لوٹ آئی۔

شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے فرشتے، جنات اور آدمی کی تخلیق میں کام کرنے والے فارمولے بیان کئے ہیں۔

''کائنات زمانی مکانی فاصلوں کا نام ہے۔ یہ فاصلے انا کی چھوٹی بڑی مخلوط لہروں سے بنتے ہیں۔ ان لہروں کا چھوٹا بڑا ہونا ہی تغیر کہلاتا ہے۔ دراصل زمان اور مکان دونوں اسی تغیر کی صورتیں ہیں۔ دخان جس کے بارے میں دنیا کم جانتی ہے اس مخلوط کا نتیجہ اور مظاہر کی اصل ہے۔ یہاں دخان سے مراد دھواں نہیں ہے۔ دھواں نظر آتا ہے اور دخان ایسا دھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔ انسان مثبت دخان کی

اور جنات منفی کی پیداوار ہیں۔ رہا فرشتہ، ان دونوں کے ملخص سے بنا ہے۔ عالمین کے یہ تین اجزائے ترکیبی غیب و شہود کے اہم کردار ہیں۔ ان کے بغیر کائنات کے گوشے امکانی تموّج سے خالی رہتے ہیں۔ نتیجے میں ہمارا شعور اور لاشعور حیات سے دور نابود میں گم ہو جاتا ہے۔ ان تین نوعوں کے درمیان عجیب و غریب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ مثبت دخان کی ایک کیفیت کا نام مٹھاس ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار انسانی خون میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دخان کی منفی کیفیت نمکین ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار جنات میں پائی جاتی ہے۔ ان ہی دونوں کیفیتوں سے فرشتے بنے ہیں۔ اگر ایک انسان میں مثبت کیفیت کم ہو جائے اور منفی بڑھ جائے تو انسان میں جنات کی تمام صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ جنات کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔ اگر کسی جن میں مثبت کیفیت بڑھ جائے اور منفی کیفیت کم ہو جائے تو اس میں ثقلِ وزن پیدا ہو جاتا ہے۔''

فرشتوں پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ اگر فرشتوں میں مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے اوپر آ جائیں تو مثبت کیفیات کے زور پر وہ انسان کے روپ میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور منفی دخان کی مدد سے جنات کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

فرشتے نورانی دنیا کی مخلوق ہیں۔ ان کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہے۔ مضمون پڑھ کر ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ نور سے بنے فرشتوں کی صلاحیت دیگر مخلوقات سے زیادہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے نوعِ آدم کو فرشتوں سے زیادہ صلاحیت عطا کی ہے اور تخلیقی فارمولوں کا علم دے کر فی الارض خلیفہ بنایا ہے۔

قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

''اور آدم کو علم الاسماء عطا کیا۔'' (البقرۃ: ۳۱)

برگزیدہ خاتون مائی جنتؒ فرماتی ہیں ــــ میں گھوڑے پر سوار جنت میں داخل ہوئی تو سات حوروں نے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے نہر پر لے گئیں، غسل کرایا اور جنت کا لباس اور زیور پہنایا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو ماتھے پر دو چاند سجے ہوئے تھے۔ کہا گیا کہ ایک چاند حوروں کا حسن ہے اور دوسرا روحانیت میں کامیابی کا چاند ہے۔ ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور اس نے کہا کہ میرے پروں پر سوار ہو جاؤ۔ میں فرشتے کے دائیں پر کے اوپر بیٹھ گئی۔ فرشتے نے مجھے جنت کے اعلیٰ مقام پہ اتار دیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ کافی دیر تک گھومتی رہی۔ یکا یک خواجہ غریب نوازؒ تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے فیروزہ کی انگوٹھی پہنائی پھر داتا صاحبؒ، حضرت لعل شہباز قلندرؒ اور حضرت شمس تبریزؒ تشریف لائے اور پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈالا۔

اس خواب کے بعد سے آپ مائی جنتؒ کے نام سے مشہور ہو گئیں۔

ناصر علی

آواز میں بند شخصیت

کسی نابینا نے کہا تھا ــــ میرے کان، میری آنکھیں ہیں۔ میں آواز سن کر شخصیت کا اندازہ لگا لیتا ہوں خواہ کوئی شخص الفاظ کے پردے میں کیوں نہ رہنا چاہے، آواز بتا دیتی ہے کہ وہ اندر سے کیا ہے۔

پتلی، موٹی، ہلکی، بھاری، نرم، کرخت، اور ناک میں بولنا، آواز کی قسمیں ہیں۔ شخصیت میں آواز کی قدر و قیمت چہرے سے زیادہ ہے۔ ہم چہرہ نہیں بدل سکتے لیکن آواز متاثر کن نہ ہو تو تھوڑی محنت سے لہجے میں حسن و کشش پیدا کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خوب صورت آواز عطا کی ہے، لہجہ اور تلفظ اسے بے کشش کر دیتا ہے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ درست ہونے میں دو تین سال لگتے ہیں البتہ فرق چند ہفتوں میں واضح ہو جاتا ہے۔

فنِ گفتار سیکھنے کا پہلا مرحلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ ہماری آواز سننے میں کیسی لگتی ہے۔ کسی نابینا نے کہا تھا:

''میرے کان، میری آنکھیں ہیں۔ میں آواز سن کر شخصیت کا اندازہ لگا لیتا ہوں خواہ کوئی شخص الفاظ کے پردے میں کیوں نہ رہنا چاہے، آواز بتا دیتی ہے کہ وہ اندر سے کیا ہے۔''

ہم صرف آنکھوں سے نہیں دیکھتے، آواز بھی دیکھتی ہے اور دیکھ کر آثار و احوال بتا دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی اس بات سے اتفاق نہ کرے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ دیکھنے کی ابتدا سننے سے ہوتی ہے۔ پھر کیسے کہا جائے کہ صرف آنکھ دیکھتی ہے؟ ذہن میں تصویر آواز سے بنتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم دو آنکھوں کے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔

طرزِ گفتار بہتر بنانے کا ایک طریقہ اپنی آواز ریکارڈ کر کے سننا ہے۔ سن کر خود سے پوچھیں کہ یہ آواز کس قسم کے شخص کی عکاسی کر رہی ہے۔ بولنے والا خوش ہے یا مغموم؟ آواز سے بیگانگی ظاہر ہوتی ہے یا یگانگت، بے ہنگم ہے یا نغمگیں؟ آواز بھید کھول دیتی ہے کہ بولنے والا کون ہے اور کن جذبات کے زیر اثر خیالات ظاہر کر رہا ہے۔ منفی جذبات لہجے میں لطافت ختم کرتے ہیں اور جذبات مثبت ہوں تو کرخت آواز بھی نرم محسوس ہوتی ہے۔

اپنی باتیں ریکارڈ کر کے غور سے سنیں۔ ریکارڈنگ پسند نہ آئے تو انکاری نہ ہوں کہ یہ میری آواز نہیں۔ یہ آپ ہی ہیں جو بول رہے ہیں کیوں کہ آواز صرف صوتی فریکوئنسی کا نام نہیں، پوری شخصیت اس میں بند ہو جاتی ہے ـــ آواز شخصیت کا آئینہ ہے۔

بعض مغربی ممالک میں ملازمت کے حصول میں معاون ادارے آواز کی اہمیت کے اس قدر قائل ہیں کہ درخواست وصول کرنے کے بجائے، درخواست دہندگان سے براہ راست بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور آواز سے اہلیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

ایک بڑے ادارے کے افسر کا کہنا تھا کہ ہماری رائے تقریباً 95 فی صد درخواست دہندگان کے بارے میں درست ثابت ہوتی ہے۔

اپنی ریکارڈنگ سن کر خود سے پوچھیں:

۱۔ کیا میرا لہجہ پُرسکون ہے؟

۲۔ میری آواز میں لچک ہے؟

۳۔ لہجے میں نرمی ہے یا شدت پسندی؟

۴۔ میں تیز بات کرتا ہوں یا ٹھہر ٹھہر کر بولتا ہوں؟

۵۔ لہجہ ایک رہتا ہے یا تبدیل ہوتا ہے؟

۶۔ کیا میری آواز سامعین کو اچھی لگے گی؟

۷۔ کیا میرے لہجے میں وہ خصوصیات ہیں جو میں دوسروں کی آواز میں دیکھنا چاہتا ہوں؟

کہتے ہیں کہ بولنا تہذیب کی نشانی ہے اور خموشی کا دوسرا نام گوشہ گیری* ہے۔ لوگ ہماری بات کا کس طرح جواب دیتے ہیں، انحصار ہماری آواز پر ہے۔

لب و لہجے کی اصلاح کیسے کی جائے؟

اصلاح ـــ خامی کے اعتراف کے بعد ہوتی ہے۔ مثالی طرزِ گفتگو کے لئے خوب صورت لہجے کے حامل لوگوں کو سنیں۔ ان کی آواز نقل نہیں کریں، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ان کے لہجے میں موجود اچھی گفتگو کے طریقِ کار اور اصول اپنائیں۔ آواز ریکارڈ کر کے سننے اور اصلاح سے تھوڑے عرصے بعد لہجے میں تبدیلی محسوس ہوگی۔

فنِ گفتگو کی تربیت لینے والی ایک لڑکی نے بتایا کہ مجھے اپنی مختلف آوازیں سن کر عجیب محسوس ہوا کہ کیا یہ میں ہوں؟ میں نے اصلاح کی اور لہجہ دل آویز ہوتا گیا۔ اندازہ ہوا کہ لہجہ اگر اچھا بھی ہو، اصلاح کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

لہجہ بہتر کر کے آواز خوب صورت بنانے کا طریقہ مشکل نہیں۔ ریکارڈنگ کر کے اپنی خامی خود دور کرنے کے علاوہ درج ذیل نکات کا دھیان رکھیں۔

---

* گوشہ گیری (تنہائی میں رہنا، خلوت نشینی)

۱۔ آواز میں غیر معمولی خصوصیات تلاش کریں۔

کیا آپ کی آواز میں تنوع ہے۔۔۔؟ متنوع آواز گفت وشنید کے لئے مددگار ہے۔ یکساں لہجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بولنے والے کو مخاطب کی مطلق پروا نہیں، اپنی ذات میں زیادہ دلچسپی ہے۔اس لاپروائی کا آواز کی دیگر چار خصوصیات زور، رفتار، لَے اور زیر وبم پر برا اثر پڑتا ہے۔ لہجے میں مناسب زور پیدا کریں، نہ زیادہ نہ کم۔مثلاً حکم دینے اور عرض کرنے کا انداز الگ ہے۔ سوال پوچھنے اور جواب دینے کا طریقہ ایک نہیں ہوتا۔ جذبات ظاہر کرتے وقت لہجے میں جوش اور گہرائی ہوتی ہے۔ ہمدردی کا انداز تحکمانہ نہیں ہوسکتا۔خوشامدی لوگوں کا لہجہ بناوٹی ہوتا ہے اور مخلص آواز میں فطرت کے مطابق قوت ہوتی ہے۔ لہجے کو دلکش بنانے کے لئے جذبات کا جائزہ لیں۔ جذبات سے الفاظ میں جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ مزاج اور رفتار میں مطابقت پیدا کریں۔

بولنے کی رفتار اہم ہے۔ ایک منٹ میں 125 الفاظ بولنا اوسط رفتار ہے۔ الفاظ اس سے بہت کم ہوں یا 200 تک پہنچ جائیں تو لہجہ بے اثر ہوگا۔

ایک رفتار پر بولنے سے آدمی اور مشین میں فرق نہیں رہتا۔ الفاظ میں مناسب وقفہ دیں تاکہ مخاطب آپ کے ذہن کے ساتھ سفر کرے، اطمینان سے بات سنے اور آپ کو مطلب واضح کرنے میں آسانی ہو۔ گفتگو میں ربط پیدا ہونے سے ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر جانا سہل ہوجاتا ہے، اور کس لفظ پر زور دینا ہے اور کسے سرسری طور پر ادا کر کے گزرنا ہے، اس کی بھی مشق ہوتی ہے۔

۳۔ لہجے میں زیر وبم پیدا کریں۔

مردوں کی آواز بھاری ہوتی ہے۔ بچوں کی آواز بڑوں کے مقابلے میں تیز اور عورتوں سے بھاری ہوتی ہے۔آواز کا زیر وبم درست کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کوئی کتاب یا ناول بلند آواز میں پڑھیں، ساتھ ساتھ لَے اور زیر وبم پر غور کرتے جائیں۔ مختلف کرداروں کے مکالمے پڑھنے سے جذبات پر فرق پڑتا ہے، اثر لہجے میں ظاہر ہوتا ہے اور آواز کی تیزی خود بخود کم ہوجاتی ہے۔ تلفظ ٹھیک کرنے کے لئے لغت سے مدد لیں۔

۴۔ سانس پر قابو رکھیں۔

سانس پر توجہ دینے سے لہجے کی ساری خامیاں دور ہوجاتی ہیں۔ خیال رکھیں کہ سانس چھوڑتے وقت آواز نہ گرے۔ ایک سانس میں کہانی بیان کرنے کی ضرورت نہیں، مخاطب کو سننے، سوچنے اور سمجھنے، اور اپنے آپ کو بولنے کے لئے وقت دیں۔ اس سے گفتگو میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

سانس کا خیالات اور جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ خیالات تبدیل ہونے سے سانس کی رفتار بدل جاتی

ہے۔ جب جذبات قابو میں رہتے ہیں تو سانس لینے میں دشواری نہیں ہوتی۔ خیال رکھیں کہ زبان سے الفاظ اس طرح ادا ہوں کہ مخاطب انہیں الگ الگ سنے اور سمجھ سکے۔ خواہ کتنی گھبراہٹ طاری ہو، چہرے پر ظاہر نہیں ہونی چاہئے کیوں کہ جس جذبے کی متواتر ترجمانی ہوتی ہے، وہ کچھ عرصے بعد اندر میں پیدا ہو جاتا ہے۔

لہجے کو بہتر بنانے کی مشق کروانے والے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ میں نے ہزاروں طالبات وطلبا کو تربیت دی ہے اور سب میں شخصیت اور آواز کے درمیان ایک تعلق دیکھا۔ اس نے بتایا کہ

''ایک طالبہ کی عمر 30 سال تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ میرے پاس آئی اور میں نے اسے اس کی آواز ریکارڈ کر کے سنائی تو وہ چیخ پڑی۔ اس کی چیخ میں الزام تراشی تھی۔ میں نے کہا، تم کسے الزام دے رہی ہو؟ بولی، کسی کو نہیں۔ وہ شادی شدہ تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم اپنے لہجے کا ذمہ دار شوہر کو سمجھتی ہو؟ ہانپتے ہوئے کہا، نہیں! نہیں! دو ہفتے بعد اعتراف کیا کہ میں شوہر کو کبھی جواب نہیں دیتی۔ میری آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ جو زبان سے نہ کہہ سکی، آواز سے ظاہر ہو گیا۔ اس نے باقاعدگی سے کلاسیں لیں۔ آواز تیزی سے بدلتی گئی اور شوہر سے تعلق بھی اچھا ہو گیا۔ ذہنی پریشانی دور کرنے میں بولنے کی مشق سے مدد مل سکتی ہے کیوں کہ آواز کی اصلاح سے ہمارے اندر ہمت پیدا ہوتی ہے۔''

لہجہ درست کرنے کے لئے ذہنی صلاحیت کے ساتھ جسمانی صلاحیت درکار ہے۔ یعنی ٹھیک طور سے سانس لیا جائے اور بولنے والے اعضا میں حرکت آزادانہ ہو۔ اچھی طرح بولنے کے لئے لمبے سانس لینے کی عادت ہونی چاہئے۔ سانس لیتے وقت پیٹ باہر اور خارج کرتے وقت پیٹ اندر ہو۔ اس مشق سے جلد معلوم ہو جائے گا کہ لمبے سانس لینا کتنا مفید اور سکون بخش ہے۔

۵۔ منہ کھول کر بات کریں۔

بات کرتے وقت ہونٹوں کی حرکت واضح ہو۔ منہ کی کشادگی کا اندازہ لگانا چاہیں تو دو انگلیوں کو (ایک دوسرے کے اوپر) دانتوں کے درمیان میں رکھیں۔ اگر یہ وقت طلب معلوم ہو تو سمجھ لیں کہ آپ منہ کو مناسب طریقے سے کھولنے کے عادی نہیں۔ دہن کی کشادگی میں زیادہ آسانی پیدا کرنے کے لئے منہ بند کر کے نچلے جبڑے کو ہلانے کی مشق کریں۔

ہونٹ اور زبان بھی بولنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس انداز سے بات کرتے ہیں جیسے ان کی زبان میں ہڈی ہو۔ آواز کی کرختگی یا شیرینی میں تربیت کا بڑا دخل ہے۔ جو بچے والدین اور گھر کے دوسرے افراد کو شیریں انداز سے گفتگو کرتا دیکھتے ہیں، ان کا لب ولہجہ دلکش ہوتا ہے۔ تیز

طبیعت یا جھگڑالو والدین کے بچوں کی آواز میں کشش کے بجائے نفرت ہوتی ہے۔

زبان نرم اور لچک دار عضو ہے، اس میں ہڈی نہیں۔ جن لوگوں کی زبان بے لچک ہے، انہیں لچک پیدا کرنے کے لئے ورزش کرنی چاہئے۔

ورزش: زبان اندر باہر اور دائیں بائیں گھمائیں۔ اس کے علاوہ زبان سے ناک اور ٹھوڑی چھونے کی کوشش کریں۔

بولنے میں دوسرا اہم عضو تالو ہے۔ تالو کا فعل سمجھنے کے لئے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر دہن کو خوب کھولیں اور آئینے میں دیکھئے۔ اب 'آہا' کہیں۔ پھر 'انگ' کہیں۔ بعد ازاں لفظ 'انگ' کے آخر میں ن، گ کی آواز غور سے سنیں اور دیکھیں کہ گوشت کا ٹکڑا جو حلق میں لٹکا ہوا ہے، ان حروف کو ادا کرنے کے لئے کیسے متحرک ہوتا ہے۔ روزانہ چند منٹ اس ورزش سے آواز میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔

گفتگو اور شخصیت دونوں ایک ہیں۔ بات کرنے کا مقصد صرف اپنی بات دوسروں تک پہنچانا نہیں۔ لہجے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے تعلقات خود اپنے ساتھ کیسے ہیں۔ آدمی جتنا تن درست ہے، اس کی گفتگو بے تکلف، پر زور، معنی خیز اور بار آور ہوتی ہے۔ گفتگو اظہار خیال کا ذریعہ ہونے کے ساتھ لوگوں میں ہمارا تعارف ہے۔

یہ ابلاغِ عامہ کا دور ہے۔ گھر سے لے کر دفتر تک ہر شعبے میں گفتگو کے فن کی اہمیت ہے۔ لہٰذا اچھی گفتگو سے بہرہ ور ہونا چاہئے۔ فنِ گویائی سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خود کو مناسب حد تک تبدیل کریں۔ خود کو بدل کر گویائی بہتر بنا سکتے ہیں اور گویائی بہتر بنا کر ہم خود بدل جاتے ہیں۔

بزرگ آواز بہتر کرنے کی مشقیں بتاتے ہیں:

۱۔ بڑا مٹکا لے کر اس میں منہ ڈالیں اور نعت پڑھیں یا قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھیں۔ پڑھتے وقت آواز کی گونجار سنیں۔ یہ آواز اچھی کرنے کا میکانزم ہے۔ مٹکے میں منہ ڈال کر بولنا، مٹکے میں آواز کا پھیلاؤ ہے۔ ایسی صورت میں آواز بلند کرنا مٹکے کے اندر دائرے میں آواز گونجنا ہے۔ اب جو آواز کانوں میں آئے گی، وہ مختلف ہوگی۔

۲۔ کھلی جگہ شمال رخ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر ناک کے نتھنوں سے اندر سانس لیں۔ سانس 20 سیکنڈ روکیں۔ 20 سیکنڈ کے بعد منہ گول کرکے (جیسے سیٹی بجاتے وقت ہوتا ہے) سانس باہر نکالیں لیکن اس میں آواز ہو۔ یہ عمل ایسی جگہ کیا جائے جہاں لوگوں کی چلت پھرت نہ ہو۔

اقتباسات

''ماہنامہ قلندر شعور'' کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

دنیا، تاج وتخت، مال و دولت، شان وشوکت اور جاہ وجلال سب عارضی ہے۔ اس میں دل لگانا، فلاح نہیں، نجات نہیں۔ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے اور اللہ کی محبت میں ان نعمتوں کو نہ صرف خود استعمال کرتا ہے بلکہ دوسروں کی بھی مدد کرتا ہے تو دنیا اس کے لئے راحت بن جاتی ہے اور یہاں سے جانے کے بعد بھی وہ پُرسکون ہوتا ہے۔ (مرسلہ: ثوبیہ رشید، کراچی)

قطرہ سمندر سے باہر کتنا چھوٹا ہے اور سمندر میں کتنا عظیم۔ یہ کائنات تسلیم و انقیاد (فرماں برداری) کا ایک سمندر ہے۔ ہم خوگر تسلیم بن کر اس کائنات کا ایک جزو بن جاتے ہیں۔ نہیں نہیں بلکہ پوری کائنات بن جاتے ہیں۔ جھکنا (تسلیم) ہی وہ زینہ ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔

(کتاب: ایک اسلام، مرسلہ: محمد ابراہیم۔ سانگھڑ)

زمین پر ذرّات دراصل مٹی کے فارمولے ہیں۔ زمین پر مٹی کہیں سرخ ہے، کہیں سیاہ ہے، کہیں بھربھری ہے، کہیں چکنی ہے، کہیں پہاڑ کی طرح سخت ہے اور کہیں دلدل ہے۔ زمین کی ایک خاصیت جو ہر جگہ اپنا مظاہرہ کرتی ہے یہ ہے کہ زمین ماں کی طرح اپنے بطن میں کسی بیج کو نشوونما دیتی ہے۔ جس طرح ماں پہلے دن سے بچے کو بطن میں ایک نظام کے تحت، تخلیقی پروسیس کے مطابق نشوونما دے کر پیدا کرتی ہے اسی طرح زمین بھی بے شمار بیجوں کو الگ الگ تخلیق کر رہی ہے۔ ہم جب زمین کے اوپر موجود تخلیقات کے اوپر غور وخوض کریں تو یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ زمین دراصل کسی تخلیق کو مظہر بنانے کے لئے بنیادی مسالا فراہم کرتی ہے۔ (کتاب: صدائے جرس، مرسلہ: عاطف اقبال، کراچی)

نیرّاعظم

انگور کھٹے ہیں

انگور اونچائی پر تھے۔لومڑی نے ان تک پہنچنے کی پوری کوشش کی لیکن کام یابی نہیں ہوئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جب آخری بار چھلانگ لگائی اور انگور ہاتھ نہ آئے تو حسرت سے یہ کہہ کر چل دی کہ ـــــ انگور کھٹے ہیں۔

موسم گرما کی تیز دھوپ، حبس زدہ ماحول اور پسینے میں تر لباس مزاج پر گراں گزرتا ہے لیکن موسم کوئی بھی ہو، اس کی شدت بے مقصد نہیں۔ سخت گرمی میں ایک طرف جراثیم کا خاتمہ ہوتا ہے، دوسری طرف فصلیں پکتی ہیں جن کے پھلوں کا پورے سال انتظار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں دو رخ کا قانون ہر موسم میں قائم رہتا ہے جیسے گرمی میں ٹھنڈے اور سردی میں گرم مشروبات اور اجناس کی ضرورت۔ سردی میں یخنی پسند کی جاتی ہے، گرمی میں ٹھنڈے مشروبات کی طلب بڑھ جاتی ہے۔

موسم گرما کے خاص پھل آم کا ذکر تقریباً ہر محفل میں ہوتا ہے۔ آم کچا ہو یا پکا ـــــ بہر صورت پسند کیا جاتا ہے۔ کچے آم کو کیری کہتے ہیں جو کھانوں میں کھٹاس کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور اس کا شربت موسم گرما کے پسندیدہ مشروبات میں سے ہے۔

گرمی میں پسینہ زیادہ آنے سے جسم سے نمکیات خارج ہوتی ہیں اور پانی کم ہو جاتا ہے۔ کیری جسم میں پانی کی کمی دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ معدے کے امراض، قبض، ہیضہ، سینے میں جلن، متلی وغیرہ میں مفید ہے۔ جسم میں چربی جذب کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے ساتھ غذا میں موجود نقصان دہ جراثیم ختم کرتی ہے۔ کیری کے سفوف کو آم چور کہتے ہیں جو مسوڑھوں کی بیماری کا ایک علاج ہے۔

کیری کھٹی ہوتی ہے اور کھٹاس کا ذکر کیری کے اچار کے بغیر ادھورا ہے۔ دال یا تہاری کے ساتھ کوئی کھٹی چیز نہ ہو تو کیری کی قاشیں ملانے سے کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

کیری آم کے درخت میں اگنے والا ایسا پھل ہے جو کچا ہونے پر بھی شوق سے کھایا جاتا ہے اور

پکنے کے بعد بادشاہت کا تاج پہن لیتا ہے۔سوال یہ ہے کہ اتنا کھٹا پھل مٹھاس میں کیسے تبدیل ہوا اور کھٹاس کہاں چلی گئی—؟

کئی محققین اس سوال کی طرف متوجہ ہوئے جس کے بعد کیری اور آم کے اجزا پر تحقیق کی گئی۔

بتایا جاتا ہے کہ کیری میں 23 فی صد کے قریب پانی ہے۔مٹھاس تقریباً پونے چھ فی صد اور پروٹین آدھے فی صد سے زیادہ ہے۔ وٹامن بی کمپلیکس، سوڈیم اور فولاد کی معمولی مقدار شامل ہوتی ہے۔ وٹامن اے اور سی، پوٹاشیم اور فاسفورس قلیل مقدار جب کہ کیلشیم اور میگنیشیم کثرت میں پایا جاتا ہے۔

مٹھاس سے بھرپور آم میں سوڈیم، کیلشیم اور فولاد کی بہت معمولی مقدار کے علاوہ کئی وٹامن موجود ہیں۔اس میں وٹامن اے، سی اور کاربوہائیڈریٹ کی مقدار اچھی صحت کے لئے مفید ہے۔آم میں کیری کے مقابلے میں ایسڈ اور کاربوہائیڈریٹ کی مقدار بہت کم ہے جب کہ دونوں میں مٹھاس کے تناسب سے سب واقف ہیں۔

آم اور کیری میں مقداروں کا تناسب دلچسپ ہے۔کیری میں ایسڈ زیادہ ہے اور یہی کیری جب آم میں تبدیل ہوتی ہے تو ایسڈ تقریباً غائب ہوجاتا ہے۔ محقق جاننے کی کوشش میں ہیں کہ کیری میں ایسڈ کہاں غائب ہوتا ہے اور آم میں مٹھاس کیسے آتی ہے۔

مٹھاس کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ کیری میں موجود انزائم، اسٹارچ کو توڑ کر مٹھاس میں تبدیل کرتا ہے، اس عمل کو ہائیڈرولائسز کہتے ہیں۔انزائم کاربوہائیڈریٹ میں خاص تناسب سے پانی ملا کر اسٹارچ توڑتے ہیں جس سے مختلف قسم کی مٹھاس بنتی ہے اور رس کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔اس طرح کھٹی کیری میٹھے آم میں تبدیل ہوتی ہے۔ البتہ اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا کہ کھٹاس جس کی بنیادی وجہ ایسڈ ہے، کیری سے آم بننے کے بعد کہاں گئی۔

باطنی علوم کے ماہرین فرماتے ہیں کہ تمام طبعی قوانین روحانی قوانین کا اتباع کرتے ہیں۔ان میں ایک قانون یہ ہے کہ چاند کی کرنیں اشیا میں مٹھاس پیدا کرتی ہیں یعنی کرنیں کیری میں داخل ہوکر اسے آم میں تبدیل کردیتی ہیں۔آموں میں مٹھاس کا تناسب کرنوں کی مقدار پر منحصر ہے۔کسی میں کرنیں کم داخل ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پھلوں اور اجناس میں مٹھاس کی وجہ چاند کی کرنیں ہیں۔

کیری کے بعد انگور کی کہانی پڑھیں۔

لومڑی کہیں جارہی تھی۔راستے میں درخت نظر آیا جس پر انگور کے گچھے لٹکے ہوئے تھے۔بھوک لگی تھی۔

چھوٹے بڑے گچھے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ کہتے ہیں کہ بھوک میں جو مل جائے، اچھا لگتا ہے جب کہ یہاں خوش شکل اور مزے دار انگور تھے۔

انگور اونچائی پر تھے۔ لومڑی نے ان تک پہنچنے کی پوری کوشش کی لیکن کام یابی نہیں ہوئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جب آخری بار چھلانگ لگائی اور انگور ہاتھ نہ آئے تو حسرت سے یہ کہہ کر چل دی کہ انگور کھٹے ہیں۔

لومڑی نے کیوں کہا کہ انگور کھٹے ہیں ــــ؟

آم جیسے میٹھے پھل کی طرح انگور بھی پکنے سے پہلے کھٹے ہوتے ہیں۔ انگوروں میں کھٹاس کی وجہ تیزابی مادے ہیں جو کچے انگوروں میں وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ آم کے برعکس انگور صرف درخت پر پکتے ہیں۔ کچے آم تھیلی میں بند کر کے، جہاں دھوپ پڑتی ہو یا آٹے میں رکھ دیں تو وہ پک جاتے ہیں اور کھٹاس مٹھاس میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس انگور اگر کچے اتار لئے جائیں تو وہ نہیں پکتے۔

انگور کچے ہوں یا پکے ــــ معدے اور نظامِ ہضم کے لئے مفید ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے ایک مصنف محمد مومن صاحب نے 'تحفۃ المومنین' نامی کتاب میں کچے انگوروں کے ہاضمے پر اثرات کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ چربی والی غذائیں کھانے کے بعد کچے انگوروں کا جوس پینا فائدہ مند ہے کیوں کہ یہ چربی گلنے اور نظامِ ہضم میں مدد دیتا ہے۔ بعد میں آنے والے محققین نے اس کی توثیق کی۔

قرآن کریم میں جن پھلوں کے نام ہیں ان میں انگور شامل ہے۔ سورہ انعام میں پھلوں کے پکنے کے عمل پر غور وفکر کا حکم دیا گیا ہے۔

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے۔ پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں۔ اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ہر ایک کی خصوصیت جدا جدا ہے۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور ان کے پکنے کی کیفیت غور سے دیکھو۔''

(الانعام: ۹۹)

انگور کو بادشاہوں کا پھل کہا جاتا ہے۔

اینٹی آکسیڈنٹس یا تکسیدی مادوں سے بھرپور انگور دل اور خون کی شریانوں کے لئے مفید ہے۔ کیل مہاسوں سے حفاظت، جوڑوں کے درد، آنکھ اور دماغ کی صحت کے لئے بھی معاون ہے۔

ہم اپنے سوال کی طرف واپس آتے ہیں کہ کھٹے

انگور میٹھے کیسے ہو گئے—؟

بتایا جا چکا ہے کہ انگور میں کھٹاس کی وجہ تیزابی مادے ہیں۔ محقق کہتے ہیں کہ جیسے جیسے گرمی بڑھتی ہے، تیزابی مادے ٹکڑوں میں بکھر کر بہت کم رہ جاتے ہیں جس سے انگور میں مٹھاس غالب ہو جاتی ہے۔

مٹھاس کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ انگور کا درخت اپنے پھل کو مٹھاس فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگور کے گچھے درخت سے اتار لئے جائیں تو یہ مزید نہیں پکتے، اور کھانے والا یہی کہتا ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے:

''ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم اس سے سبق لو۔'' (الذّٰریٰت: ۴۹)

جب ایک شے دو رخ میں ہوتی ہے تو غالب مغلوب کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ شے متضاد رخ سے پہچانی جاتی ہے یعنی کھٹاس محسوس ہونے کی وجہ مٹھاس ہے اور مٹھاس کے غلبے کی وجہ کھٹاس مغلوب ہونا ہے۔ مغلوب مقداروں کی اسپیس اتنی کم ہو جاتی ہے کہ شعور ان کا ذائقہ محسوس نہیں کرتا، بالکل اسی طرح جیسے خواب میں میلوں میل فاصلہ طے ہونے پر فاصلے کی طوالت یعنی وقت کا احساس نہیں ہوتا۔

آم کی گٹھلی اور انگور کے بیج سے دوبارہ کھٹاس ظاہر ہوتی ہے اور ایک وقت کے بعد مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی بہت سی اشیا ہیں جن کے استعمال میں معمولی رد و بدل سے تاثیر بدل جاتی ہے۔

پھلوں کے علاوہ سبزی کی بات کی جائے تو ایک عام مثال پیاز کی ہے جو دنیا کے تقریباً ہر بڑے پکوان میں استعمال ہوتا ہے اور عمومی طور پر روزمرہ کھانوں میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی سبزی ہے۔

امریکا میں پیاز کی نیشنل ایسوسی ایشن کے اعداد و شمار کے مطابق عالمی سطح پر پیاز کی سالانہ پیداوار 105 بلین پاؤنڈ ہے۔ اس ادارے کا کہنا ہے کہ پوری دنیا میں ہر فرد ایک سال میں اوسطاً 13.67 پاؤنڈ (تقریباً 14 پاؤنڈ) پیاز کھاتا ہے اور لیبیائی باشندوں میں یہ شرح سب سے زیادہ ہے۔

پیاز میں تیزی ہوتی ہے۔ یہ سلاد میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور بصد شوق کھایا جاتا ہے۔ یہی پیاز سالن میں مٹھاس پیدا کر دیتا ہے۔ بتایئے پیاز کی تیزی کہاں گئی اور مٹھاس کہاں سے آ گئی—؟

ہر شے میں غور و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔ نشانی استعارہ ہے جو منزل کا پتہ دیتی ہے۔ تخلیقات میں نشانیوں کا مطلب یہ ہے کہ ہر تخلیق—خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی صنّاعی ہے جو بندے کو ذات و صفات کے عرفان تک لے جاتی ہے۔

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج و زوال، عشق و سرمستی اور فنا و بقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا میلان ماورائی علوم کی طرف تھا۔ اس نے پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لئے ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کا انتخاب کیا جہاں صدیوں پرانی داستان صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہونے کی منتظر تھی۔ ٹیکسلا میں ہزاروں برس قبل کے کشان دورِ حکومت کا شہزادہ ملا جو اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسے شہزادے سے دور رکھنے کے لئے مکروہ صورت بوڑھا بجرولال سامنے آیا اور ردا کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ نیلم کے ذریعے بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شہزادے اور اس کے ساتھیوں کے ہم زاد کو شیطانی چیلوں سے آزاد کرنے کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ملاقات کے بعد وہ گھر جا رہی تھی کہ راستے میں حادثہ پیش آیا۔ نیلم کو کم چوٹیں آئیں لیکن ردا کو ماں چلی گئی۔ اسپتال میں ردا کے اندر سے روشنی کا پرت نکلا اور ماضی میں سفر کرتے ہوئے ہزاروں سال پہلے کے تبت میں لے گیا۔ غیبی قوتیں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ یہاں ایک پہاڑ پر بنی عبادت گاہ ردا کا مسکن قرار پائی۔ ردا سے پہلے عبادت گاہ میں بزرگ ماں رہتی تھیں جو ان دنوں شہزادے کے علاج کے لئے محل گئی ہوئی تھیں۔ علاقے میں شیطانی قوتوں کو ردا کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے مشکلات کھڑی کیں لیکن قدرت اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ شہزادہ صحت یاب ہوا اور بزرگ ماں محل سے لوٹ آئیں۔

جب میں وہاں پہنچی تو بزرگ ماں پُرسکون انداز میں آسن جمائے بیٹھی تھیں اور کچھ فاصلے پر آدم خور قبیلے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص بے حس و حرکت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ ذرا دیر پہلے یہاں گھمسان کا رن پڑا ہے۔

ماحول کا جائزہ لے رہی تھی کہ بزرگ ماں کی آواز گونجی، آؤ سکھی! ایک سے بھلے دو اور دو سے بھلے تین۔ آؤ سکھی! بَن باسیوں کے ساتھ ہم بھی دعا میں شامل ہو جائیں ورنہ بارش پورے بَن (جنگل) کو تہس نہس کر دے گی۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں سواری پر سے اتر کر بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈ میں سے مینڈرل ببون (بندروں کی ایک نسل) قطار در قطار وہاں جمع ہونے لگے۔

مادہ بون نے بچوں کو چٹانی چھجے کے نیچے بٹھایا پھر سب ہمارے دائیں بائیں ترتیب سے بیٹھے اور بزرگ ماں کی پیروی کرتے ہوئے ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کئے۔ بارش میں بھیگے ہوئے چھوٹے معصوم بچے حیرت سے دعائیہ عمل میں مشغول اپنے ماں باپ کو دیکھ رہے تھے۔

گوزم جو پہلے ہی بزرگ ماں کے رعب و دبدبہ سے متاثر تھا، یہ منظر دیکھ کر اس کے دل میں ان کا ادب بڑھ گیا۔ ٹانگ گھسیٹتا ہوا بزرگ ماں کے دائیں جانب پیچھے کی طرف بیٹھ گیا۔ جانوروں نے چہرے آسمان کی طرف کر لئے۔ گوزم عبادت کے اس طریقے سے ناواقف تھا مگر اپنے مہربان کی تقلید میں، دعا میں شامل ہو گیا۔

میرے ایک جانب سفید سانپ سرپ پندورا کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ سب کی طرح اس کی نظریں آسمان کی طرف تھیں۔ بزرگ ماں کی مناجات کے ساتھ میں بھی خشوع و خضوع کے ساتھ رب ذوالجلال کے حضور دعا گو تھی کہ خیر کی بارش ہو۔ سب گڑگڑاتے ہوئے عاجزی سے طوفانی بارش کے تھمنے کی دعا کر رہے تھے۔ بون کے ساتھ دوسرے جانور بھی دعا میں شریک ہو گئے۔

اللہ کے فضل سے اجتماعی دعا کا اثر یہ ہوا کہ موسلا دھار بارش ہلکی بوندوں میں تبدیل ہو گئی۔ مینڈرل بون خوشی سے آوازیں نکالتے ہوئے درختوں کی طرف بڑھ گئے اور باقی جانور بھی تیزی سے گھنے جنگل میں گم ہو گئے۔

خستہ حال گوزم سوجی ہوئی زخمی ٹانگ کے ساتھ بت بنا بیٹھا تھا۔ بزرگ ماں کی رفاقت میں اس نے عقل سے ماورا کئی واقعات دیکھ لئے تھے۔ انہونی یہ تھی کہ اس کا ذہن اپنے قبیلے سے مختلف تھا۔ بزرگ ماں نے اس کی جان بچائی تھی اور وہ اب تک اس کے ساتھ تھیں۔

یہاں پہنچ کر میں نے کوئی بات نہیں کی اور جو ہوتا رہا، خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اس مقام پر تھوڑی دیر قیام کے بعد تین افراد پر مشتمل ہمارا قافلہ عبادت گاہ کی جانب روانہ ہوا۔ گوزم کو سانبر پر سوار ہونے میں مدد دی اور اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔

علاقہ کچا تھا اس لئے بارش کی وجہ سے ہر طرف کیچڑ تھی۔ بزرگ ماں کسی رکاوٹ کو خاطر میں لائے بغیر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ عصا میرے ہاتھ میں تھا اور میں ان کے پیچھے تھی۔

بادل چھٹنا شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ بادلوں کے پھیلنے سے اندھیرا بھی دور ہوا۔ سفر تیز رفتاری سے جاری تھا۔ اب تک کسی بھی طرف سے رخنہ اندازی

نہیں ہوئی تھی ۔ میں خیالات کی بھول بھلیوں میں گم فاصلہ طے کر رہی تھی۔ جیسے ہی خیالات کی دنیا سے باہر آتی محسوس ہوتا کہ طویل سفر طے کر لیا ہے۔

پھر خیالات کی رو تبدیل ہوئی اور ذہن شہزادہ جے ونت کی طرف چلا گیا ۔ بادشاہ کذل کڈ فیز بیٹے کی صحت یابی کے بعد اسے محل لے گیا جو پٹنہ میں تھا۔ جے ونت کے خیال نے فلم کی صورت اختیار کر لی اور ذہن پٹنہ میں عالی شان محل پر مرکوز ہو گیا۔

جے ونت باغ میں ٹہل رہا تھا، اضطراب اس کی حالت سے عیاں تھا۔ یہ منظر صرف میں نہیں، محل میں خواب گاہ کی کھڑکی سے بادشاہ اور ملکہ بھی دیکھ رہے تھے۔ دونوں اس کی اضطرابی کیفیت کی وجہ سے فکرمند تھے۔ بیٹا موت کے منہ سے نکل آیا تھا مگر اس نے اپنے ماں باپ کے لئے ایک اور پریشانی کھڑی کر دی تھی۔ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آداب کا۔ ضد تھی کہ بزرگ خاتون سے ملنا ہے۔

کشان بادشاہ کذل کڈ فیز بزرگ ماں کی غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے لوگوں کے لئے قیمتی سے قیمتی شے مٹی کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جب وہ ٹھکرانے پر آتے ہیں تو تاج وتخت چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بغیر کسی معاوضے اور انعام کے شہزادے کے صحت یاب ہوتے ہی روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ کے لئے صورت حال پریشان کن تھی کہ ایک طرف بزرگ ماں کا درویشانہ مزاج اور دوسری طرف خود سر شہزادے کی ضد جسے وہ کوئی اور نام دینے سے ڈرتا تھا۔

دوسری جانب اسی محل میں موجود سفلی عمل کرنے والی لچھاوی اور اس کا بیٹا دندان بزرگ ماں اور مجھے نقصان پہنچانے کے لئے سازشیں بن رہے تھے۔ پھر منظر نگاہ سے ہٹ گیا۔

میری نظریں محل سے واپس آ چکی تھیں یعنی تصور کے پردے پر چلنے والی فلم دھندلا گئی۔ ہمارا قافلہ عبادت گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں نے گوزم کو سہارا دے کر اتارا۔ آیوشی اور بھرگوی بزرگ ماں کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ سلابھا کی ماں کو ہوش آ گیا تھا مگر نقاہت باقی تھی۔

گوزم کا زخم صاف کر کے ایک بار پھر مرہم پٹی کی گئی۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مطمئن اور اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہا ہے ۔ بزرگ ماں کی توجہ سے اس پر اچھے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ پیٹ بھر کر کھانا ملا تو وہ کھانا کھا کر سو گیا۔ آیوشی اور بھرگوی نے اس کے لئے کمرا تیار کر دیا تھا۔ بزرگ ماں اور میں نے مرکزی جھونپڑے میں رات گزاری۔

صبح صادق کے وقت حسب معمول آیوشی اور

بھرگوی آ گئیں ۔ ناشتے کی بھرپور تیاری کی گئی تھی۔ سب نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ علاج اور آرام کرنے سے گوزم کی حالت کافی بہتر ہوگئی تھی۔

ناشتے کے بعد بزرگ ماں نے تبت جانے کے لئے رخت سفر باندھا۔ سواری کے لئے سانبر موجود تھا۔ معمول تھا کہ وہ انہیں دشوار گزار پہاڑی راستوں سے منزل مقصود تک پہنچا کر لوٹ آتا۔ ان کی منزل کا کسی کو علم نہیں تھا، سوائے اس کے کہ تبت کی پہاڑیوں میں اپنے استاد کے پاس جارہی تھیں ۔ وہ ان پہاڑوں میں کہاں رہتے تھے، کسی کو خبر نہیں تھی۔

استاد سے متعلق کئی مرتبہ آیوشی اور بھرگوی سے سنا تھا مگر انہیں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ گوزم پریشانی کے عالم میں بزرگ ماں کی روانگی کی تیاری دیکھ رہا تھا۔ سلابھا اور اس کی ماں موریا، گوزم سے دور بیٹھی تھیں۔ حلیے سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ آدم خور ہے اس لئے خوف زدہ تھیں۔

بزرگ ماں نے اشارے سے انہیں تسلی دی کہ یہ بے ضرر ہے، تب جا کر ان کا خوف دور ہوا۔

گوزم کے لئے ہم اجنبی تھے ۔ وہ یہاں ٹھہرنے کے بجائے بزرگ ماں کے ہمراہ جانا چاہتا تھا۔ انہوں نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور بیگ میں ضروری سامان رکھتے ہوئے پالی زبان میں بولیں،

''ہے گوزم! کیوں پریشان ہے۔ ساتھ چلنا ہے تو سمجھ لے کہ پیروں میں چھالے، حلق میں کانٹے اور آنکھوں میں پتھر پڑ جائیں گے۔ ہے گوزم! جا لوٹ جا اپنوں میں۔ ہمارے ساتھ رہنے کے لئے حوصلہ چاہئے۔ جا لوٹ جا!''

الفاظ میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ گوزم کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کہ پیر کی تکلیف فراموش کر چکا ہے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولا،

''مہربان خاتون! مجھے کچھ ہوگیا ہے۔ اگر آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میرے اپنے مجھے پہلے ہی چھوڑ چکے ہیں، میرا علاج صرف آپ کے پاس ہے۔''

گوزم گھبرا گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے زار و قطار رو رہا تھا۔ ہم لوگ حیران تھے جب کہ بزرگ ماں بے نیازی سے اپنی چیزیں سلیقے سے کپڑے کے بیگ میں رکھ رہی تھیں۔ توقف کے بعد بولیں،

''ٹھیک ہے۔ جب تو نے بھسم ہوکر راکھ بننے کی ٹھان لی ہے تو پھر عہد کر کہ حکم عدولی نہیں کرے گا۔''

گوزم کی آواز میں جان آ گئی۔

''نہیں کروں گا، ہرگز نہیں کروں گا۔ آپ کے لئے جان حاضر ہے۔ قسم کھاتا ہوں نیلے آسمان اور سر سبز پہاڑوں کی، ابھرتے ہوئے سورج اور ڈوبتے ہوئے ستاروں کی کہ میں مطیع رہوں گا۔''

بزرگ ماں نے آیوشی کی طرف رخ کرتے ہوئے

کہا، سانبر کو کھول دے تا کہ وہ جنگل سے اپنا جوڑی دار لے آئے۔ جب اِس نے مرنے کی ٹھان لی ہے تو پھر ایسے ہی سہی!

آیوشی سانبر کے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ بزرگ ماں کے الفاظ سے گوزم کو توانائی ملی۔ وہ زخم بھول کر تیزی سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھو کر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ موقع اچھا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے۔ میں نے پوچھا، کیا آپ کچھ دن ہمارے ساتھ قیام نہیں کریں گی؟ انہوں نے کہا،

''ہے سکھی! میں تم سے جدا کب ہوں جو تم ساتھ رہنے کی بات کرتی ہو۔ کائنات کا ہر ذرّہ دوسرے ذرّے سے بندھا ہوا ہے۔ سو ہم تم بھی ایک تار سے بندھے ہوئے ہیں۔ ازل سے ابد تک نورانی لہر کسی فاصلے کی محتاج نہیں۔ پھر ہے سکھی! کیوں نا نورانی لہر کو سمجھ لیں تا کہ ملن اور جدائی جیسے کھوکھلے لفظوں سے نجات مل جائے—؟''

مجھے وہ وقت یاد آیا جب ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن جب میں کسی مشکل میں پھنستی تو مدد کے لئے مترنم آواز سماعت میں گونجتی تھی۔

پوچھا، بزرگ ماں! وقت کیا ہے—؟

سکھی! جو کچھ ہونا تھا قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ جو ہو چکا ہے، ہم تم وہی دیکھ رہے ہیں۔ اب وقت ساکن ہے یا گزر رہا ہے، اس کا فیصلہ تم خود کرو۔ وقت کی حقیقت سے واقف ہونے والوں کے لئے فاصلے حذف ہو جاتے ہیں۔ باقی رہ گئے الفاظ، تو وہ کھوکھلے تصویر خانے ہیں جن کی شکل ہے مگر یہ شکل حقیقت کو پردے میں رکھ کر ظاہر کرتی ہے۔

میں کسی حد تک ان کی بات سمجھ گئی۔

بزرگ ماں! کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ گوزم کے مرنے کی بات کیوں کر رہی تھیں؟

آہ — گوزم — آہ! کیسا راستہ چن لیا۔

وہ مخاطب مجھ سے تھیں لیکن دیکھ اس کی طرف رہی تھیں جو زمین پر نظریں جمائے ان کے حکم کا منتظر تھا۔ پھر اس سے پوچھا، تو کیا کھاتا ہے رے؟

وہ گھبراتے ہوئے بولا، گوشت کھاتا ہوں۔

ٹھیک ہے۔ آج سے تو سب کھائے گا مگر گوشت نہیں کھائے گا۔ اس نے تیزی سے گردن ہلائی۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں، لو سکھی! یہ تو خوراک سے مر گیا۔ ان کا جملہ سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ مرنے کا مفہوم وہ نہیں جو میں سمجھ رہی ہوں۔ پھر کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

تھوڑی دیر بعد سانبر کے ساتھ اس کے قد کاٹھ کا ایک اور سانبر مرکزی جھونپڑے کے سامنے باغیچے میں داخل ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ

سے باہر کا منظر واضح تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارا پالتو سانبر کیسے ایک جنگلی سانبر کو سواری کے لئے راضی کر کے لے آیا۔

لو بھئی جوبی پہاڑ کے باسیو! سواری آ گئی ہے۔ تیار ہو جاؤ بھائی گوزم! طویل پہاڑی سفر درپیش ہے۔ میرے استاد میری راہ دیکھ رہے ہیں۔

سب انہیں الوداع کہنے باہر آئے۔

بھرگوی نے جنگلی سانبر پر زین ڈالی تو وہ بدک گیا۔

رہنے دے بھرگوی! لا مجھے دے، یہ تجھ سے راضی نہیں ہوگا۔ بزرگ ماں نے زین درست کی۔ وہ جنگلی سانبر کی گردن سہلاتے ہوئے اس طرح بات کر رہی تھیں جیسے پہلے سے جانتی ہوں۔

پھر میری سمت مڑتے ہوئے بولیں،

''سکھی! یہ بَن (جنگل) تو انہی کا ہے جس پر ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ کیسا توکل ہے ان کا۔ کیسا بھروسا ہے ان کا۔ کیسا یقین ہے ان کا۔ یہ بَن باسی اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ ان کا یقین راسخ ہے کہ کفیل مطلق فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بس مٹی کا پتلا آدمی ہے جو من میں چھپے پارس نما جوہر سے بے خبر، اپنا مقام بھلائے نچلی سطح پر چلا گیا ہے۔''

وہ جنگلی سانبر پر سوار ہوئیں اور گوزم پالتو سانبر پر۔ دو افراد پر مشتمل قافلہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

(قسط:۱۴)

آٹھ سالہ لڑکا اپنے والد کے ہمراہ دامنِ کوہ سے گزر رہا تھا۔ چلتے چلتے توازن بگڑا اور لڑکھڑا گیا۔ درد کی لہر اٹھی اور وہ چلّایا، آ آ آ.....آ!

خاموش ہوتے ہی آ آ آ.....آ کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ حیرت ہوئی کہ کیا کوئی اور بھی تکلیف میں ہے؟ تلاش کرنے کے لئے چاروں جانب دیکھا، پہاڑوں کے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔

تجسس سے پوچھا، تم کون ہو—؟

جواب میں وہی آواز سنائی دی، تم کون ہو—؟

ایک طرف پیر میں تکلیف اور دوسری جانب آواز کا معمّا، تلملاتا ہوا اونچی آواز سے بولا، بزدل!

جواب ملا، بزدل۔

لڑکے نے والد سے پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟

وہ مسکرائے اور پہاڑوں کی سمت دیکھتے ہوئے بلند آواز سے کہا، میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

جواب میں کسی نے کہا، میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے دوبارہ کہا، تم فاتح ہو۔

آواز آئی، تم فاتح ہو۔

لڑکے نے والد سے پوچھا، یہ کون ہے؟

انہوں نے بتایا، ہماری تمہاری بازگشت ہے اور اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ زندگی ہمیں وہی لوٹاتی ہے جو ہم اسے دیتے ہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے، وہ اتفاق نہیں— ہمارے عمل کا عکس ہے اس لئے بات اچھی کہو۔

عبدالسلام خورشید

پنجاب کے عوامی گیت

اے بڑے دیس کی رانی! تم کیوں پریشان ہو۔ وہ چھوٹے دیس کا باسی میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ جب میں میدان میں اتروں گا تو میری تلوار اور ڈھال اسے چین نہ لینے دے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اگلی صبح کا کھانا تب تک نہیں کھاؤں گا جب تک اسے شکست نہ دے دوں۔

جب تاریخ مرتب نہیں ہوئی تھی، اس وقت عوامی گیت ترقی و تنزل، محبت و نفرت، بہادری و بزدلی اور وفا و بے وفائی کی داستانوں کے امین تھے۔ لوگ خاص کر خواتین آنکھوں دیکھے واقعات گیتوں میں بیان کر دیتی تھیں اور وہ زبان زد عام ہو جاتے تھے۔ بہادری و محبت کی داستانیں گیتوں کی گود میں پلتی رہیں۔ گیت دلوں کو تڑپاتے اور برماتے رہے۔ گانے اور سننے والے انہیں سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے۔ گویا یہ امانت تھی جسے انہوں نے مؤرخین اور آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھا۔

تاریخ اور عوامی گیتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ یہ ثقافتی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ پنجابی زبان کے نامور شاعروں نے اعلیٰ درجے کی نظموں میں تاریخی واقعات قلم بند کیے۔ وارث شاہ اور ہاشم شاہ نے روحانی اور رومانوی کلام میں جابجا تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن یہ عوامی گیت نہیں ہیں۔ جانے پہچانے شاعروں کا کلام خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، عوامی گیت کے زمرہ میں نہیں آتا۔

❋

راجا رسالو: ایک صدی قبل تک پنجاب میں راجا رسالو کا قصہ بہت مشہور تھا۔ کچھ حصہ نثر اور کچھ نظم میں ہے۔ اسے پیش کرنے کے لیے ایک شخص الغوزہ (بانسری نما ساز) بجاتا اور دوسرا منظوم حصہ گاتا تھا پھر موسیقی رکتی اور ڈرامائی انداز میں نثر سنائی جاتی۔ دوبارہ الغوزہ بجتا اور گیت شروع ہو جاتا۔

راجا رسالو، دوسری صدی عیسوی کے ایک بادشاہ، سالباہن کا بیٹا تھا۔ اس کی سلطنت موجودہ سیالکوٹ سے راولپنڈی تک قائم تھی۔ راجا رسالو قسمت آزمائی کے لئے نکلا۔ وہ غریبوں کا غم خوار اور مظلوموں کی آواز بن گیا— عوام نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔

اس کی اچھائی کے گیت کئی صدیوں تک گائے جاتے رہے جن میں اس کے اوصاف اور کارنامے بیان کیے گئے۔ علاوہ ازیں گیتوں میں جن شہروں اور شخصیات کا ذکر ہے، ان کی شہادت تاریخی کتب میں ہے جیسے گندگڑھ۔ یہ اٹک کے شمال میں دریائے سندھ کے قریب واقع پہاڑی سلسلے کا قدیم نام ہے۔ اسی طرح ووہمان کا گاؤں، باغ نیلاب کے قریب ایک گاؤں کا اولین نام ہے، اور سرکپ کا شہر جہاں راجا رسالو نے دو شیزاؤں کو اپنی بہادری سے مرعوب کیا، اس کے آثار ٹیکسلا میں ہیں۔

جب اس شہر کے کھنڈرات دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ان مقامات کے آثار ملے جہاں رسالو نے راجا سرکپ کے ساتھ چوپڑ کا کھیل کھیلا تھا۔ یہاں چوپڑ کے آٹھ خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ (چوپڑ شطرنج کی طرح کا کھیل ہے)۔ سرکپ شہر کے بارے میں ایک گیت کے چند بول یاد ہیں جس میں سرکپ کی ایک رانی رسالو سے کہتی ہے،

نیلے گھوڑے والیا، نیویں نیزے آ
اگے راجا سرکپ ہے سرلیسی اوہ لاہ
بھلا چاہیں اپنا تاں پیچھے ہی مڑجا

ترجمہ: اے نیلے گھوڑے والے! آگے بڑھنے سے پہلے نیزہ نیچے کرلو کیوں کہ آگے راجا سرکپ ہے جو مغروروں کا سر اتار دیتا ہے۔ اپنا بھلا چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ۔ جواب میں راجا رسالو کہتا ہے:

دُوروں بیڑہ پُچیا، ایتھے فتح آئے
سرکپ دا سرکٹ کے ٹوٹے کرساں چار
تینوں بنا ساں وو ہٹڑی، میں بنساں مہراج

ترجمہ: میں دور دراز سے آیا ہوں اور جیت کر جاؤں گا۔ راجا سرکپ کا سر کاٹ کر چار ٹکڑے کروں گا اور تمہیں دلہن بنا کر خود راجوں کا راجا بنوں گا۔

رانی، راجا سرکپ کے پاس گئی اور کہا،

اک جو آیا راج پوت کروا ماروں مار
تینوں راجا مارسی اتے سانوں کھڑسی نال

ترجمہ: ایک راج پوت یلغار کرتا ہوا آرہا ہے تاکہ تمہیں مار دے اور مجھے رانی بنا کر لے جائے۔

راجا سرکپ کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ وہ بولا،

چھوٹی نگری دا واسکن، رانی وڈی کرے پکار
جد میں نکلاں باہر تاں میری تاں نچاوے ڈھال
نجرے روٹی تاں کھاساں، سرلیساں اتار

ترجمہ: اے بڑے دیس کی رانی! تم کیوں پریشان ہو۔ وہ چھوٹے دیس کا باسی میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ جب میں میدان میں اتروں گا تو میری تلوار اور ڈھال اسے چین نہ لینے دے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اگلی صبح کا کھانا تب تک نہیں کھاؤں گا جب تک اسے شکست نہ دے دوں۔

راجا سرکپ اور راجا رسالو کا سامنا ہوا۔ رسالو نے

اس کا سر کاٹ کر رانی کو ساتھ لیا اور ان پہاڑوں کی طرف چلا گیا جو راولپنڈی کے جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ راولپنڈی اور ٹیکسلا کے درمیان میں ایک مقام سنگ جانی آتا ہے، اس قصے میں اس کا بھی ذکر ہے۔ علاوہ ازیں راجا ہودی کا تذکرہ ہے جس کا دارالحکومت ہودی نگری، اٹک کے قریب دریائے سندھ پر واقع تھا۔ اسی قصے میں ہودی کے باپ راجا اٹلی مل کا سراغ ملتا ہے جس کی سلطنت اٹک سے جلال آباد تک پھیلی ہوئی تھی۔

پورن بھگت: راجا رسالو کے بھائی پورن بھگت کو گیان دھیان میں دلچسپی تھی۔ اس نے عبادت کی طرف متوجہ ہو کر ماورائی علوم حاصل کرنے میں وقت صرف کیا۔ پورن کے نام پر سیالکوٹ سے دو میل دور شمال کی طرف پورن والا گاؤں ہے جہاں ایک کنواں پورن کے کنوئیں کے نام سے مشہور ہے۔

روایت ہے کہ راجا سالباہن نے اپنی نئی دلہن لوناں کے کہنے پر پورن کے ہاتھ کاٹ کر اس کنوئیں میں پھینکے تھے۔ پورن بھگت مظلوم تھا۔ ظلم کا بدلہ نہیں لیا۔ سلطنت چھوڑ دی اور زندگی عبادت میں گزاری۔ لوگوں میں مقبول ہوا اور گیت مشہور ہو گئے۔

❋

سیف الملوک: سیف الملوک کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول ہے۔ کہتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں سیف الملوک نامی تاجر سندھ کے تاریخی شہر الور کے قریب سامانِ تجارت سے بھرے جہازوں کا قافلہ لایا۔ علاقے میں راجا دیورائے کی حکومت تھی۔ سیف الملوک کے جہاز لوٹ لئے گئے۔ راجا نے تاجر سے کہا، اپنی خوب صورت کنیز بدیع الجمال میرے حوالے کرو۔ کہتے ہیں کہ سیف الملوک نے تین دن کی مہلت مانگی۔ اس دوران ہزار ہا مزدور لگا کر بند باندھا اور دریا کا رخ بدل کر اپنے جہاز لے گیا۔ مذکورہ روایت کے مطابق اس قصے میں باقی جو کچھ ہوا، وہ رنگ آمیزی اور عوام کی تخیل سازی ہے۔

❋

اس زمانے میں رؤسا کے شجرۂ نسب یاد رکھے جاتے تھے جن کو موسیقار خاص تقاریب میں گیتوں کی شکل میں پڑھتے تھے۔ ان کو کرسی نامے کہا جاتا ہے۔ اسی طرح فقرا کے شجرے بھی مشہور ہوئے۔

اول پیر آسا دوم پیر خاصا
سوم پیر صفا چہارم پیر جھپرا
ہارے کا مُل جیتے کا پہلوان
سر جنا مت پائی سچے شاہ کلّا ٹکائی

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ذکر اس طرح سے ہے:

توں پیر تمامی پیراں دا
غم دور کرو دل گیراں دا
یا غوث الاعظم جیلانیؒ

صوفیائے کرام کے واقعات لاشمار عوامی گیتوں کا موضوع بن چکے ہیں۔ معروف ولی اللہ، سائیں سخی سرورؒ کا اصل نام سید احمد سلطان ہے۔ ان کے خاندان نے گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں روحانی علوم کو فروغ دیا۔ ایک عوامی گیت میں سائیں سخی سرورؒ کا تذکرہ اس طرح سے ہے،

سب توفیقاں سائیں سچے
جملیاں دے رب پردے کجے
آپے دیندا، آپے لیندا
صاحب داتا سکل جیاں دا
انے کوڑھے چنگے کردا
لگے درد گوایا

پنجابی زبان کے عوامی گیتوں میں مسعود سالار غازی کی مدح بھی ہے۔ ان کو بڑے میاں اور بھالے میاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسعود سالار غازی اجمیر کے حاکم کا بیٹا اور محمود غزنوی کا بھانجا تھا۔ اجمیر میں پیدا ہوا پھر غزنی پہنچا۔ 17 برس کی عمر میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آیا اور سرگرمیوں کا مرکز یوپی کو بنایا۔ یہاں کئی سال تبلیغ کی۔ مقامی راجاؤں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ بہادری اور شجاعت سے لڑا۔ آخری معرکہ میں واصل بحق ہوگیا۔ اس کی تعریف میں عوامی گیت مشہور ہوگئے۔

پہلی عالمی جنگ میں جب بھرتی زوروں پر آئی تو اس زمانے میں کسی لڑکی نے اپنے محبوب کی یاد میں یہ بول گائے جو بہت مقبول ہوئے۔

چند گھر ڈاکے، میں چڑھی آں چبارے
ویکھاں چو کوئی جانی نظر نہ آوے
ساڈا صبر فرنگئے نوں مارے
ناں ویندا چھٹیاں، نہ طلباں تارے
نوکر رکھ لے توں، چھڑے تے کنوارے
ناں ہون زناں، ناں پین پواڑے

مفہوم: میں چاند کی روشنی میں اپنی چھت پر چڑھی مگر دور دور تک کوئی اپنا نظر نہیں آیا۔ ہمارا صبر (ہمارا اپنا) فرنگیوں سے نبرد آزما ہے۔ نہ وہ چھٹیاں لیتا ہے نہ ہمارا تاروں کو گننا خاطر میں لاتا ہے۔ اوپر سے تم نے نوکر بھی وہ رکھ لئے جو کنوارے ہیں یا جن کی بیویاں ان کے ساتھ نہیں۔ سارا مسئلہ ہمارا عورت ہونے کا ہے۔

یہ پنجابی زبان میں عوامی گیتوں کا مختصر جائزہ ہے۔ دنیا بھر میں عوامی گیتوں کو تاریخ کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ مؤرخین ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہمارے مؤرخین بھی عوامی گیتوں کا مطالعہ کریں تاکہ تاریخ کے جو پہلو اوجھل ہیں یا روایات اور اوہام کے پردے میں چھپ گئے ہیں، وہ ظاہر ہوں۔

نفیسہ شاکر

بخش دو گر خطا کرے کوئی

کہتے ہیں کہ مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر نے فوج کو حکم دیا تھا کہ کوئی سپاہی باہمی تنازعے کی شکایت متعلقہ افسران کو فوراً پیش نہ کرے بلکہ شکایت کرنے والا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے پہلے نیند لے اور جاگنے کے بعد شکایت درج کروائے۔

اکثر لوگ حال کا مستقبل سے موازنہ کرتے ہوئے تاسف سے کہتے ہیں کہ ہم وہاں نہیں، جہاں ہونا چاہئے تھا۔ وجہ پوچھیں تو سارا الزام مواقع نہ ملنے اور حالات کو دیا جاتا ہے۔ احساس محرومی کا رونا رونے والوں کو کوئی ان نوجوانوں کی خبر دے جو پیلے اسکولوں سے پڑھے اور پسماندہ علاقوں سے دنیا کی بڑی بڑی جامعات میں پہنچے۔ دادی کہتی تھیں کہ ہمارے وقت میں تعلیم کا معیار اچھا تھا، محنت کی قدر تھی، بات سننے کا حوصلہ اور برداشت زیادہ تھی اور گھر میں تربیت پر توجہ دی جاتی تھی۔ آج بچوں کو کچھ کہہ دو تو اماں ابا برا مانتے ہیں حالاں کہ سود سے بیاج پیارا ہوتا ہے۔

دادی ہم سے بہت پیار کرتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر سرزنش بھی۔ اماں نے کبھی برا نہیں مانا۔ ایک بار میں نے دوڑ میں حصہ لیا اور روتا ہوا گھر آیا۔ دادی نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے بتایا کہ دوست کی وجہ سے چوتھے نمبر پر آیا ہوں۔ دادی بولیں، کوئی کسی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہتا۔ دوڑ پر توجہ دینے کے بجائے دوست کی طرف دیکھا ہی کیوں۔ تمہارا راستہ آگے تھا، پیچھے نہیں۔ جب تک دوسروں کو الزام دو گے، کامیابی نہیں ملے گی۔

اپنی کوتاہی پر دوسروں کو الزام دینا دراصل اعتراف ہے کہ ہم اعصابی اور ذہنی طور پر کم زور ہیں۔ زندگی میں راحت اور آزمائش دونوں ہیں۔ دائمی راحت کے لئے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے کیوں کہ آزمائشیں ہر موڑ پر آتی ہیں۔ ان کو بوجھ سمجھنے کے بجائے حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے سامنا کریں تو اعصاب کو تقویت ملتی ہے اور آزمائش سے گزرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ قدرت نے لاشمار ذہنی اور جسمانی وسائل ودیعت کئے ہیں، ہم نے ان کا عشر

عشیر بھی استعمال نہیں کیا۔ ورنہ وہ سب حاصل کر لیتے جس کی تمنا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

(بنی اسرآءیل: ۵۳)

جن الفاظ سے دل آزاری ہو، وہ شیطنت ہے۔ اپنی ناکامی پر دوسروں کو الزام دینا عام رویہ ہے۔ لگ بھگ ہر فردنجی معاملات سے لے کر پیشہ ورانہ امور تک اپنے معاملات میں دوسروں کو قصور وار سمجھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ہمارا خیر خواہ نہ ہو لیکن ان کو اپنے اعصاب پر حاوی کر کے ہم خود بھی اپنے خیر خواہ نہیں۔ رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے تو نظر انداز کر کے اپنا کام کرتے رہیں، زیادہ مجبوری ہو تو راستہ بدل لیں لیکن وہ ہماری ناکامی کا ذمہ دار نہیں۔ ہم نے اس کو اہمیت دے کر اپنا راستہ کھوٹا کر دیا۔

دو دوست سفر میں تھے۔ ان کی تربیت اس نہج پر کی گئی تھی کہ وہ صنف نازک کی کشش سے دور رہیں۔ ندی کنارے لڑکی ملی جسے دوسری طرف جانا تھا لیکن وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ہمدردی کے تحت ایک دوست نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بحفاظت ندی پار کروائی۔ دوسرے دوست کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ دیر تک خاموش رہا۔ کافی دیر بعد اظہار کیا کہ تم نے لڑکی کا ہاتھ کیوں پکڑا—؟

پہلے دوست نے کہا، میں نے انسانی ہمدردی کے تحت اسے ندی عبور کرنے میں مدد دی اور ہاتھ چھوڑ دیا لیکن تم نے تو اسے اب تک ذہن پر سوار کیا ہوا ہے!

نکتہ چینی اور الزام تراشی سے اپنی غلطی نظر نہیں آتی کہ جس بات کا گلہ ہم دوسروں سے کرتے ہیں، خود اس کا موجب ہوتے ہیں۔ چند واقعات نظر سے گزرے جن کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ سوچنے کی طرز درست نہ ہو تو آدمی مجرم بھی بن سکتا ہے۔

کسی شہر میں جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل گئی کہ پولیس نے ڈاکوؤں کے مطلوب سرغنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اس کی منظم ڈکیتیوں اور لوٹ مار نے پولیس کا ناک میں دم کر دیا تھا اور عوام خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ بچے تنگ کرتے تو اماں ڈراتی تھیں کہ بات نہیں مانی تو ڈاکو آ کر لے جائے گا۔

پولیس کے درجنوں سپاہی اور متعلقہ اداروں کے عہدہ داروں نے شہر کے مضافات میں مکان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ انہیں اطلاع ملی تھی سرغنہ بیوی بچوں سے ملنے گھر آیا ہے۔ آس پاس مکانوں کی چھتوں پر مشین

گنیں نصب کی گئیں اور آنسو گیس پھینکنے کے انتظامات تھے تاکہ سرغنہ کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ دو گھنٹے تک دونوں جانب سے گولیوں کی تڑ تڑاہٹ سے گردو نواح گونج اٹھا۔ بالآخر سرغنہ نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ اس کی نسبت مشہور تھا کہ وہ شراب پیتا ہے نہ تمبا کو نوشی کا عادی ہے البتہ ڈکیتی اور قتل و غارت گری میں کوئی ثانی نہیں۔

ڈاکوؤں کے سردار کی اپنے متعلق کیا رائے تھی، وہ بھی پڑھ لیں۔ اس سے قبل جب وہ زخمی حالت میں فرار ہوا تو پولیس کو خط لکھا:

''میرے پہلو میں افسردہ مگر مہربان دل ہے۔ ایسا مہربان جس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔''

چند ہفتوں بعد گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ تختۂ دار پر لے جایا گیا تو اس نے کہا،

''یہ مجھے اپنی جان کی حفاظت کا صلہ ملا ہے۔''

گویا اپنی دانست میں اس نے جو کچھ کیا، خود کو بچانے کے لئے تھا۔ ایک عرصے تک دہشت پھیلانے والا مرتے دم تک خود کو صحیح سمجھتا رہا۔ کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ یہ ایک مجرم کا رویہ ہے۔ اکثر لوگ اسی طرز پر سوچتے ہیں اس وجہ سے غلط کو صحیح سمجھ کر غلطی کا تدارک نہیں کرتے۔ اب یہ بھی پڑھئے۔

''میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال لوگوں کی خدمت اور ان کی مدد کرنے میں صرف کئے اور اس کا صلہ مجھے ملامت، نفرت، حقارت اور تنہائی کی صورت میں ملا۔''

یہ الفاظ بھی کسی مشہور رہزن کے ہیں۔ نصف زندگی جیل کی اندھیر کوٹھڑی میں گزری۔ آخری بار سزا بھگت کر جیل سے رہا ہوا تو بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے نے جھریوں کا جامہ پہن لیا تھا۔

ایک روز وہ شیر کے بچے کو کندھوں پر اٹھائے بازار سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پوچھا، کیا حال ہے؟

بولا، شیر کے بچوں سے دل بہلاتا ہوں۔

پوچھا، گزشتہ زندگی پر نادم ہو؟

سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، میں نے کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ ہمیشہ امیروں اور سرمایہ داروں کو لوٹا۔ جابروں کو تنگ کیا اور ظالموں کی تاک میں رہا پھر بھی لوگوں نے میری قدر نہ کی۔ نادان دنیا اپنے محسن کو سمجھ نہ سکی۔

وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

معاشرے میں ناانصافی تھی اور اسے انصاف کی امید نہیں تھی اس لئے ظالم سے بدلہ لینے اور غریبوں کی مدد کے لئے ڈکیتی کا راستہ اپنایا یعنی ناانصافی کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ یہ جرائم کا جواز نہیں ہو سکتا۔ برائی — برائی سے نہیں رکتی۔ جو توانائی رہزنی اور قتل و غارت گری میں خرچ کی، وہ مثبت کردار ادا کر کے معاشرے کو بیدار کرنے کے لئے بھی خرچ کی جا سکتی تھی۔

ایک مجسٹریٹ دوست کا کہنا ہے کہ میں نے ہزاروں مقدمات سنے اور فیصلے کئے ۔ چند مثالوں کے سوا کسی مجرم نے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ثبوت ہوتے ہوئے بے گناہی پر اصرار کیا اور جھوٹی صفائی پیش کی۔مجسٹریٹ دوست نے کہا کہ صرف غریب آدمی مجرم نہیں ہوتا، چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز پڑھے لکھے افراد بھی مجرم ہوسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔

اس ذہنیت کا مظاہرہ روزمرہ واقعات میں عام ہے۔تقریباً ہر شخص اپنے سوا پوری دنیا کو ملامت کرتا ہے۔مالک ملازموں کی بددیانتی، کوتاہی، سستی اور بے جا مطالبات پر شکوہ کناں ہے اور ملازم کام کی زیادتی، کم تنخواہ اور تحقیر آمیز سلوک کا رونا روتا ہے۔ بیٹے کو باپ سے گلہ ہے اور باپ کو بیٹے سے شکایت ہے۔شوہر بیوی کی فضول خرچی اور زبان درازی سے نالاں ہے اور بیوی شوہر کی بے جا سختی، شک اور غصے سے پریشان ہے۔خامیاں دونوں طرف ہیں اور دونوں اپنے گریبان میں نہیں دیکھتے۔اپنی آنکھ کا شہتیر کسی کو نظر نہیں آتا، دوسرے کی آنکھ کا تنکا کھٹکتا ہے۔اپنے اندر جھانکنے سے 95 فی صد مسائل ختم ہوجاتے ہیں۔اس کے برعکس تنقید اور اعتراض سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے جن کے لئے یہ رویہ اپنایا جاتا ہے۔

شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے استاد شمس العلما سید میر حسن فرماتے ہیں:

''میرے 50 سالہ تدریسی تجربے کا حاصل یہ ہے کہ نکتہ چینی ایسا احمقانہ فعل ہے جو کبھی کارگر اور مفید ثابت نہیں ہوا۔''

ہر شخص ہر شعبے میں ماہر نہیں ہوتا۔اس حقیقت کو قبول کریں، آپ الزام تراشی اور نکتہ چینی سے محفوظ رہیں گے۔یہ افعال مدافعت کی ترغیب دیتے ہیں اور آدمی اپنی سچائی کے جواز میں دلیلیں ڈھونڈتا ہے۔

کہتے ہیں کہ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے فوج کو حکم دیا تھا کہ کوئی سپاہی باہمی تنازعے کی شکایت متعلقہ افسران کو فوراً پیش نہ کرے بلکہ شکایت کرنے والا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے پہلے نیند لے اور جاگنے کے بعد شکایت درج کروائے۔اس حکم کی خلاف ورزی پر سزا مقرر تھی۔

الزام تراشی غصے کی ایک شکل ہے اور غصہ جھاگ ہے۔جھاگ اٹھنے سے طوفان نظر آتا ہے، جھاگ بیٹھتا ہے تو کچھ نہیں ہوتا۔

''جو لوگ غصہ پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کردیتے ہیں، اللہ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے۔'' (اٰل عمرٰن:۱۳۴)

ایک صاحب نے مجھے اپنا واقعہ سنایا۔

''میرے دوست بلیک مارکیٹنگ کے مقدمے میں گرفتار ہوئے۔ جرم ثابت ہوا۔ انہوں نے گواہوں میں میرا نام لکھوادیا۔ چاہتے تھے کہ میں ان کے لئے جھوٹ بولوں جو مجھ سے نہ ہوسکا۔ انہیں سزا ہوگئی۔ چند روز بعد ملاقات کے لئے جیل گیا تو دیکھتے ہی برس پڑے — غدار! بے وفا! مجھے پھنسانے والوں میں تم بھی شامل ہو ورنہ میرا بال بیکا نہ ہوتا۔''

نکتہ چیں کی ذہنیت پالتو کبوتر کی طرح ہے جو آسمان کی وسعتوں میں پھر پھرا کر اپنے گھر واپس آجاتا ہے۔ فراخ دل اور وسیع القلب لوگ نکتہ چینی سے احتراز کرتے ہیں اور دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی جگہ میں ہوتا تو میرا طرزِ عمل کیا ہوتا۔ دوسروں کو سمجھنے کے لئے بلند اخلاق اور فراخ دلی کی ضرورت ہے۔

نکتہ چینی اور الزام تراشی سیرت کی تعمیر کے لئے مضر ہیں۔ خامی کا اعتراف، خوش گفتاری اور ہمدردانہ طرزِ کلام سے راہ و رسم بڑھتے ہیں۔

''سیرت کی تعمیر میں خوش گفتاری اور زبان کی شیرینی کو بڑا دخل ہے۔ مذاہب نے مثالی ذہن اور معاشرے کے لئے سیرت کی تعمیر پر زور دیا ہے۔ مذاہب کی تعلیم ہے کہ وصل پیدا کرو۔ دل میں لوگوں کے لئے گنجائش رکھو۔ محبت سے غیروں کو اپنا بناؤ اور نفرت و عداوت کو حسنِ اخلاق سے دور کرو۔''

کیا آپ کے ذہن میں کوئی شخص ایسا ہے جس کو اصلاح کی ضرورت ہے —؟ خوب! بہت خوب! آپ کی نیک نیتی پر شک نہیں لیکن کیوں نہ اس تجویز کو پہلے خود پر آزمائیں۔ اپنے فائدے کے لئے دوسروں کے بجائے اپنی اصلاح زیادہ نفع بخش ہے۔ اپنے صحن میں بے ترتیبی ہو تو ہمسائے کے صحن کی گندگی کا شکوہ بے جا ہے۔

لوگوں سے معاملات کرتے وقت یاد رکھیں کہ ہم پتلوں سے مخاطب نہیں بلکہ یہ ہمارے جیسے جذبات رکھنے والے انسان ہیں، ہماری طرح خودداری اور خودنمائی کی خواہش رکھتے ہیں۔ نادان سے نادان آدمی نکتہ چینی کرسکتا ہے، نقاد بن سکتا ہے، نقص نکال سکتا ہے، اعتراض کرسکتا ہے اور نادان ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن عقل مند اور ذی شعور انسان کبھی برائی نہیں کرتا، وہ اچھائی سامنے لاتا ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ فرما گئے ہیں:

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک دو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

سرورق کی تشریح

اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں بچے کی نشوونما، حفاظت، خوراک کی فراہمی، مناسب درجۂ حرارت اور دیگر ضروریات کا خاص انتظام کیا ہے۔ لچک دار مضبوط جھلی، جس میں پانی پُر ہوتا ہے، میں بچہ تقریباً نو (9) ماہ تک معلق رہتا ہے۔ سانس لینے کے لئے آکسیجن اور غذا کی ترسیل مسلسل جاری ہے۔ بچے کا شعور ماں باپ کے شعور سے مل کر بنتا ہے۔ اسپرم اور بیضہ ماں باپ کی طرف سے فراہم ہونے والے تخلیقی خلیے ہیں جن کے اندر ابا آدمؑ اور اماں حوّا تک پوری نسل کا ریکارڈ ہے۔ یہ ریکارڈ اسپرم اور بیضہ کے مراکز میں موجود کروموسوم میں ہوتا ہے۔ کروموسوم انتہائی باریک دھاگا نما ساخت DNA کے گچھے کی شکل میں اکٹھا ہونے کی حالت ہے۔ ڈی این اے ایک دوسرے کے گرد بل کھاتی ہوئی لڑیوں پر مشتمل پیچیدہ نامیاتی سالمہ (مالیکیول) ہے جو بنیادی طور پر ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن اور فاسفورس سے بنا ہے۔ ڈی این اے میں دو آمنے سامنے کی لڑیاں (ذہن) جس ترتیب سے آپس میں کیمیائی طور پر جڑتی ہیں وہ ترتیب فرد کی انفرادیت اور تشخص کا تعین کرتی ہے۔

بچے کو جس قسم کی طرز فکر، عادات اور اطوار والدین کی طرف سے تخلیقی خلیوں (اسپرم اور بیضہ) کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں، اس سے بچے کا شعور بنتا ہے۔ چناں چہ وہ ماں باپ کی وساطت سے آباؤ اجداد اور اسلاف کا شعور بھی حاصل کر لیتا ہے۔ والدین کو اپنے آباؤ اجداد سے جو سوچ ملتی ہے وہ جینیاتی ریکارڈ سے حاصل ہوتی ہے۔ ساتھ

ساتھ ماحول، دوست احباب اور معاشرے سے منتقل ہونے والی سوچ بھی والدین کے جینیاتی ریکارڈ کا حصہ بنتی ہے۔ نطفے کے ذریعے منتقل شدہ ریکارڈ کی بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے لیکن معاشرے اور ماحول سے ملنے والی مجموعی سوچ بچے کے ریکارڈ کا حصہ کیسے بنتی ہے۔۔۔؟

ذہن جس شے کو دانستہ نادانستہ قبول کرتا ہے، وہ حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ حافظے میں محفوظ ہونا کیا ہے؟ مادی سائنس کی رو سے دماغ میں حافظے کے لئے مختص خلیے اطلاعات کو برقی سگنلوں کی صورت میں اور پھر کیمیائی طریقے سے قبول کرتے ہیں اور اسے مخصوص کیمیائی ترتیب میں محفوظ رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ماحول سے منتقل ہونے والی اطلاعات آواز، روشنی اور لمس وغیرہ کے ذریعے فرد میں حواس خمسہ کی مدد سے داخل ہوتی ہیں۔ یہ برقی رو کی صورت اختیار کر کے دماغ میں اطلاعات منتقل کرتی ہیں۔ دماغ میں حافظے سے متعلق خلیے ان برقی اشاروں کو کیمیائی زبان میں تبدیل کرتے ہیں جو خلیوں میں تاحیات محفوظ رہتی ہیں اور یہی ریکارڈ فرد کے جسم میں بننے والے اسپرم یا بیضہ میں منتقل ہوتا ہے۔

بچہ اور درخت دونوں کتاب ہیں۔ والدین کی طرز فکر سے جو کتاب مرتب ہوتی ہے، بچے کو منتقل ہو جاتی ہے۔

''اور تم کیا سمجھے سجّین کیا ہے؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔''

''اور تم کیا سمجھے علیّین کیا ہے؟ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔''

اگر والدین کی طرز فکر میں گہرائی، ذاتی منفعت اور اغراض سے بالاتر ہو کر معاملات کو سمجھنا اور اشیا کی اصل جاننے کا ذوق ہے تو بچہ بھی ایک دن انہی صفات کے پھولوں اور پھلوں سے مزین قد آور درخت بن جاتا ہے۔ پھولوں کی رنگینی میں اصل کا کھوج لگاتا ہے اور بالآخر بفضلِ الٰہی رنگوں سے یک رنگی اور بے رنگی میں داخل ہو کر حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے۔ خدانخواستہ والدین سے سطحی سوچ بچے میں پروان چڑھتی ہے تو ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے سرورق میں دکھایا گیا ہے کہ اس سے کس قسم کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ (ح۔م۔پ)

سرورق میں زندگی کے دو رخوں کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ درخت اور بچے کے درمیان اشتراک اور تعلق کا ذریعہ نور کے دائرے ہیں۔ تصویر میں اس کی نشان دہی روشنی کے دائروں سے کی گئی ہے۔ ان دائروں کا درمیانی حصہ سفید، بے رنگی کی علامت ہے۔ وہاں سے آنول نال کے ذریعے زندگی (نور) درخت اور بچے دونوں میں منتقل ہوتی ہے۔ درخت ہو یا آدمی، اسے زندگی جس ذریعے سے مل رہی ہے، وہ ہر مخلوق میں مشترک

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی درخت کی جڑ کاٹتا ہے تو اس کی اپنی بنیاد پر بھی ضرب پڑتی ہے اور ایک درخت کے ختم ہونے سے آدمی کے لئے وقف آکسیجن میں کمی آجاتی ہے۔ غیر جانب دار ذہن جب شے کو دیکھتا ہے تو نظر آتا ہے کہ تمام تخلیقات دائرے میں بند ہیں۔ جانب دار ذہن کی نظر دائرے کے اندر بنے خدوخال پر ہوتی ہے جس میں نس در نس، شاخ در شاخ تغیر نظر آتا ہے جسے رنگ کہتے ہیں۔ رنگ اصل سے دوری ہے۔

سرورق کو پلک جھپکے بغیر دیکھا تو درخت کا وہ حصہ جو رنگ دار پھولوں سے مزین تھا اسے دیکھ کر آنکھ کے ڈیلوں میں مسلسل حرکت ہوتی رہی۔ لیکن درخت کا سبز حصہ جس میں یک رنگی ہے، وہاں نظر کے ساتھ سوچ میں بھی ٹھہراؤ آیا۔ بیج اور اسپرم کو ایک غذا ملتی ہے، ان میں نظام ایک ہے مگر غذا میں مقداروں کے فرق سے ایک طرف نوعِ آدم اور دوسری طرف نوعِ نباتات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ (عمارہ محمود۔ لندن)

پیدائش کا عمل ہر تخلیق میں مشترک ہے۔ نوعی اعتبار سے کہیں بیج، کہیں انڈہ اور کہیں پر اسپرم تخلیق کی بنیاد ہے۔ درخت کی ابتدا بیج سے ہوتی ہے اور بیج زمین سے وسائل حاصل کر کے گھٹتا، بڑھتا درخت بن جاتا ہے۔ درخت جڑ اور بچہ آنول نال کے ذریعے خوراک حاصل کرتے ہیں۔

اطلاع کے دو رخ ہیں۔ براہِ راست اطلاع قبول کرنا غیر جانب دار اور معنی پہنانا جانب دار طرزِ فکر ہے۔ بچے کی جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی نشو ونما کے لئے وسائل ماں کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔

ہر شے نور سے تخلیق ہے لیکن ہمیں نور نظر نہیں آتا۔ زمین میں طرزِ فکر پر رنگ غالب ہیں اس لئے آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جب کہ رنگ illusion ہے اور نور reality ہے۔

''اللہ کا رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔'' (البقرۃ: ۱۳۸)

اللہ کا رنگ اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مادی رنگوں یعنی ایسی طرزِ فکر قبول نہ کریں جس میں تغیر ہے۔ تغیر سے جتنی رغبت ہوتی ہے، رنگ چڑھتے رہتے ہیں اور اصل سے دوری بڑھتی ہے۔ تغیر سے جتنا دور رہیں گے اور روح یعنی زندگی کے غیر متغیر رخ میں انہماک بڑھے گا تو طرزِ فکر پر سے رنگوں کے پرت اتریں گے اور بندہ 'صبغت اللہ' سے متعارف ہوگا۔ (گلِ نسرین۔ کراچی)

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور وفکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل ودانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آج کی مشق بہت دلچسپ ہے۔ قلم اور کاغذ لے کر اماں ابا، بہن بھائیوں یا دوستوں کے ساتھ بیٹھ جایئے۔

★ کاغذ پر ایک (1) لکھ کر اس کے آگے صفر (0) بنایئے۔ یہ دس شمار ہوئے۔ 10

★ اب 0 کے آگے ایک اور 0 بنایئے، یہ سو ہوئے۔ 100

★ اس کے بعد مزید 0 کا اضافہ کیجئے۔ یہ ایک ہزار ہو گئے۔ 1,000

★ ایک صفر (0) اور لکھئے۔ یہ دس ہزار بنے۔ 10,000

★ ایک مرتبہ پھر صفر (0) کا اضافہ کرنے سے ایک لاکھ بنیں گے۔ 100,000

جتنی مرتبہ صفر کا اضافہ کریں گے، رقم بڑھتی جائے گی۔

★ اگر صفر (0) سے پہلے موجود ایک (1) ہٹا دیا جائے تو قیمت کیا ہوئی؟ 00000

س : اہمیت ایک (1) کی ہے یا صفر (0) کی ہے؟ بتایئے کہ یہ کون سا حساب ہے؟

شہنشاہ ہفت اقلیم بابا تاج الدین ناگپوریؒ فرماتے ہیں،

بندی کی گنتی نہیں، بندی میں سولاکھ

★ والدین، اساتذہ اور بزرگوں سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 20 ستمبر ہے۔

آپ کا دوست، ماہنامہ قلندر شعور

س: جولائی 2020ء میں بچوں سے سوال کیا گیا تھا کہ دنیا میں جو بیماری آئی ہے وہ ایسے وائرس سے ہے جو اتنا چھوٹا ہے کہ نظر نہیں آتا۔ سائنسی ترقی ہونے کے باوجود اس کا ابھی تک حتمی علاج دریافت نہیں ہوسکا جب کہ ہر مرض کا علاج موجود ہے؟

◇ **عفان خالد (کراچی):** دنیا میں ایسی بہت سی مخلوقات ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں لیکن ہمارے اندر ان کو دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ وائرس بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ کسی نے موجودہ وائرس نہیں دیکھا۔ بیماری پھیلنے کی وجہ سے لوگوں نے کہہ دیا کہ یہ وائرس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وائرس نہ ہو، کچھ اور ہو۔ یہ تفکر گھر میں بچوں اور بڑوں نے مل کر کیا ہے۔

◇ **زینت سلیمان، جماعت نہم (اسلام آباد):** سائنسی ترقی کے باجود نادیدہ وائرس کا علاج دریافت نہ ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم ایسا درخت ہے جس کی لامحدود شاخیں، بے شمار پتّے اور ہزار قسم کے پھول اور ان کی خصوصیات کا پورا علم دریافت نہیں ہوا، سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کے مقرب بندے ہیں۔

◇ **احمد محی الدین، جماعت ہشتم (میانوالی):** ہم یکسو نہیں ہیں۔ ذہن یکسو ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علاج انسپائر ہوجائے گا۔

◇ **نادیہ (شیخوپورہ):** علاج دریافت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا الوژن زندگی میں سفر کررہی ہے۔

◇ **فخر عباس (سرگودھا):** یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہے کہ سیدھے راستے پر لوٹ آؤ اور مجھے پہچانو۔

◇ **آصفہ ندیم، جماعت ششم (کراچی):** مقابلہ کرنے کے لئے پہلے جاننا ضروری ہے کہ ہمارا مقابلہ کس سے ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ ان دیکھی چیز سے مقابلہ کرنا ایسا ہے جیسے ہوا میں تیر چلانا۔

◇ **عبدالرحمٰن انجم (فیصل آباد):** جب تک اللہ تعالیٰ نہیں چاہیں گے، اس کا علاج ممکن نہیں۔

◇ **سونیا گوہر، جماعت ششم (پشاور):** ذہن ایک نقطے پر مرکوز ہوجائے تو علاج دریافت ہوجاتا ہے۔

دیگر بچوں کے نام: مریم، ایمان، حور، دمن، فہمیدہ، محمد احسن، عبداللہ، اریبہ، عارف، فرحین، فیضہ، محمد ریان۔

****

ہوا پر تجربہ

احمد محی الدین
کلاس ہشتم، میانوالی

حیاتیاتی طریقِ کار کے ذریعے محقق تھیوری (نظریہ) کیسے بناتے ہیں، سمجھنے کے لئے ہم نے تجربہ کیا۔

مسئلہ: مراقبہ میں دیکھا کہ سانس لیتے ہوئے ماما کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے اور میرے سینے میں۔

مشاہدہ: گھر میں سب کو مسئلہ بتایا۔ سب نے غور کیا اور کہا کہ واقعی ایسا ہے۔

مفروضہ (۱): ماما نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ میں لمبا سانس لیتی ہوں اور تم چھوٹا سانس لیتے ہو۔

تجربہ: دو گروپ بنے۔ ماما اور پاپا تجربہ کرنے والے گروپ کا حصہ بنے اور میں کنٹرول گروپ کا۔ سب نے گہرا سانس لیا۔ حسب معمول سانس لیتے ہوئے ماما کا پیٹ پھولا، اور میرا اور پاپا کا سینہ ہوا سے بھر گیا۔ اس طرح لمبے اور چھوٹے سانس کا مفروضہ مسترد ہو گیا۔

مفروضہ (۲): بات کو سمجھنے کے لئے ہم نے سوچا کہ شاید فرق مرد اور عورت کا ہے۔

تجربہ: بہن بھی شامل ہوئی۔ سانس لیتے ہوئے بہن کا پیٹ نہیں پھولا۔ یہ مفروضہ بھی مسترد ہو گیا۔

مفروضہ (۳): میں نے سوچا کہ کمر سیدھی یا جھکی ہوئی ہونا، وجہ ہو سکتی ہے۔

تجربہ: سب نے گہرا سانس لیا۔ سوائے ماما کے سب کی کمر سیدھی تھی۔ ہم تینوں کا سینہ ہوا سے بھر گیا۔

نتیجہ: تھیوری قائم ہوئی کہ جب کمر سیدھی ہوتی ہے تو سانس لینے سے سینہ پھولتا ہے جو سانس لینے کا درست طریقہ ہے۔ کمر جھکی ہوئی ہو تو سینے کے بجائے ہوا پیٹ میں بھرتی ہے، یہ سانس لینے کا غلط طریقہ ہے۔ کمر سیدھی رکھنے سے سانس کی مشق درست ہوتی ہے ورنہ سانس کی مشق کا فائدہ نہیں۔

احمد بیٹا! آپ کی کاوش پر بہت خوشی ہوئی۔ اب آپ اپنے دوستوں کو اکٹھا کریں۔ انہیں یہ پڑھ کر سنائیں اور ان کے ساتھ مل کر نئے نئے تجربات کریں۔ دیگر بچوں اور والدین سے گزارش ہے کہ وہ بھی تجربات کریں اور ادارہ کو بھیجیں۔ کوشش ہوگی کہ تجربات شائع کئے جائیں۔ (ادارہ)

سورج ـــ چہرہ

موسم خوش گوار تھا۔ خنک ہوا تھی۔ پودوں پر پتے جھوم رہے تھے۔ سورج مکھی کا پھول سورج کو دیکھ رہا تھا اور رقص کناں تھا۔ لگتا تھا سورج مکھی میں خانہ در خانہ ترتیب وار کوئی بستی آباد ہے۔ ہر خانے میں سورج کی رعایا تھی ـــ جب سورج نکلتا تو سورج مکھی کا پھول اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ جہاں جہاں سورج جاتا، سورج مکھی کی نظریں اس کا پیچھا کرتیں اور خوشی سے سرشار ہو جاتیں۔

سورج مکھی کے کچھ تخم (بیج) پک چکے تھے، باقی ابھی کچے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا ٹونی تخم تھا۔ وہ خود کو بڑے بیجوں (تخم) کے درمیان دیکھ کر سوچتا تھا کہ میں کتنا چھوٹا ہوں۔ چھوٹا سمجھنے کی وجہ سے خوف رہتا کہ کوئی پرندہ کھا نہ لے یا ہوا اڑا کر لے جائے۔ ایسا ہوا تو میرا وجود ختم ہو جائے گا۔

ٹونی تخم خود سے باتیں کرتا تھا۔ سوچتا تھا کہ مجھے کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ دائیں بائیں موجود بیج اس کی باتیں سن کر مذاق اڑاتے تھے۔

ٹونی کا ذہن مختلف تھا۔ جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا پسند کرتا۔ اگر وہ جواب دینا چاہتا تو خیال سرگوشی کرتا تھا کہ بحث کرنے سے توانائی ضائع ہوتی ہے اور ذہانت کم ہو جاتی ہے۔ توانائی ان چیزوں میں استعمال کرنی چاہئے جن سے تمہیں اور سب کو فائدہ ہو۔ ٹونی خیال کی بات سن کر ارادہ بدل لیتا اور وقت بے وقت سوچ میں گم رہتا کہ ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کا کوئی تو راستہ ہوگا۔

باغ اس کا گھر تھا ـــ اسے یہ باغ بہت پسند تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ پھول ایک وقت کے بعد مرجھا جاتے ہیں اور پھولوں کے جانے کے بعد پودا اداس رہتا ہے لیکن کچھ دنوں بعد نئے پھولوں کی آمد گزرے ہوئے پھولوں کی یاد بھلا دیتی ہے۔

ٹونی جاننا چاہتا تھا کہ پھول اور پودے کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ میں کہاں سے آیا۔ کیا میں بھی چلا جاؤں گا؟ لیکن میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا ـــ دھرتی پر رہنا چاہتا ہوں۔

شہد کی مکھیاں اور تتلیاں، ٹونی کی دوست تھیں۔ تتلیاں پھولوں پر منڈلاتیں، اس کے پاس آ کر

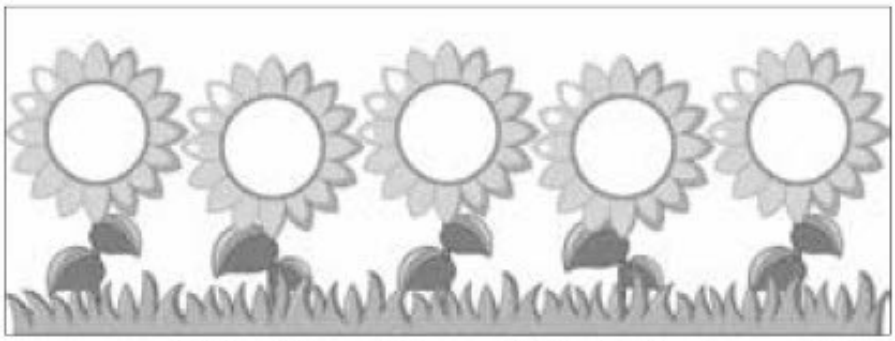

باتیں کرتیں اور اڑ جاتیں۔ شہد کی مکھیوں کو دیکھ کر وہ خوشی سے گیت گاتا تھا۔

آؤ آؤ رس لے جاؤ
اور اس رس سے شہد بناؤ

ایک رات تیز ہوائیں چلیں اور طوفانی بارش ہوئی۔ باغ میں پودوں کو نقصان پہنچا— پتے جھڑ گئے، شاخیں ٹوٹ گئیں۔ طوفان ختم ہوا۔ صبح ہوئی تو ٹونی تخم نے دیکھا کہ بہت سے ساتھی بیج غائب ہیں۔ وہ اداس ہو گیا۔

قریب موجود بزرگ بیج نے اس کی پریشانی بھانپ لی اور پوچھا، کیوں اداس ہو؟ یہ تو معمول کی بات ہے۔ آہستہ آہستہ تمام بیج چلے جائیں گے اور ان کی جگہ کوئی اور آ جائے گا۔

ٹونی تخم پریشان ہو گیا کہ سب کہاں چلے گئے!

بزرگ بیج نے فرمایا، بیجوں کا گھر بدل گیا ہے۔ کوئی زمین پر گر گیا ہے مگر ختم نہیں ہوا— پودا بن کے ظاہر ہوگا اور کوئی بیج پرندوں کی خوراک بن چکا ہے۔ وہ بھی ختم نہیں ہوا— اس کی توانائی، پرندوں کی توانائی میں شامل ہو گئی ہے۔ ہماری اور دوسری مخلوقات کی نسل چلنے کے لئے یہ سب ضروری ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے کام آئیں گے، نظام چلتا رہے گا۔ سورج کی روشنی، جس کا تم پورا دن پیچھا کر کے اپنے اندر جذب کرتے ہو، وہ تمہیں نہ ملے تو کیا ہوگا—؟

ٹونی تخم کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔ اتنے میں سرخ تتلی کھلکھلاتی ہوئی آئی اور ٹونی کا اداس چہرہ دیکھ کر بولی، بھائی! کیوں اداس ہو؟

ٹونی نے ناراضی سے کہا، تمہیں خالی گھر (خانے) نظر نہیں آ رہے؟ میرے کتنے ساتھی چلے گئے۔

تتلی بولی، یہ تو واقعی اداس ہونے کی بات ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوتا تو تم کیسے پیدا ہوتے؟

ٹونی تخم نے پوچھا، کیا مطلب؟

تتلی بولی، میری کتنی سہیلیاں مر چکی ہیں مگر خود کو فنا کر کے انہوں نے مٹی کو زرخیز بنا دیا۔ مٹی زرخیز ہوتی ہے، اس میں بیج بویا جاتا ہے، بیج کُھلتا ہے، پودا نکلتا ہے، کلی چٹختی ہے، پھول کِھلتا ہے اور پھولوں میں بیج دوبارہ ظاہر ہوتے ہیں۔ دیکھو! ایک بیج کے زمین میں جانے سے کتنے بیج پیدا ہو گئے۔ اور پھر جس پھول پر تم شان سے بیٹھے ہو، یہ پورا پھول پودے سمیت تمہارے اندر ہے۔ بیج زمین میں نہ جائے تو نسل کیسے بڑھے گی؟ خود سوچو! تم سے پہلے یہاں کتنے بیج تھے۔ تمہارے باپ دادا نے ایثار کر کے خود کو مٹی میں فنا نہ کیا ہوتا تو کیا تمہارا وجود ہوتا—؟ یہ کہہ کر تتلی اڑ گئی لیکن اسے سوچ کے سمندر میں چھوڑ دیا۔

ٹونی خاموش رہنے لگا۔

بزرگ بیج نے شفیق لہجے میں سمجھایا، بیٹا! جب تک ایک شے ختم نہیں ہوتی، دوسری پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک شکل تبدیل نہیں ہوتی، دوسری شکل چھپی ہوئی رہتی ہے۔ بیج، پودا، تنا، ٹہنی، کلی اور پھول سب تمہاری مختلف شکلیں ہیں۔ ہر شکل کا نام الگ ہے۔ بیج ایک ہے، لباس تبدیل ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ کلی ہے، یہ پھول ہے، یہ میں ہوں، یہ تم ہو۔

ٹونی ان کی بات حیرانی سے سن رہا تھا۔

اتنے میں ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا اور سورج مکھی کے پھول کے پاس رک کر سلام کیا۔

ٹونی تخم نے سلام کا جواب دیا اور کہا، سلام کرنے کا مطلب ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔ آج بی بی ہوا مجھے سلامتی کی دعائیں دے رہی ہیں اور رات کو باغ میں تباہی مچا کر گئی ہیں۔ کیا آپ کو رحم نہیں آیا؟

ہوا مسکرائی اور ٹونی کو پیار سے چھوتے ہوئے بولی، ننھے بیج! میری کیا مجال کہ میں خود سے کچھ کروں۔ اللہ کے حکم سے چلتی ہوں اور اللہ کے حکم سے رک جاتی ہوں۔ میری رفتار کم یا زیادہ ہونے کے کئی فائدے ہیں۔ میں تمہارے ساتھی بیج کہاں کہاں لے کر نہیں گئی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ان بیجوں سے کتنے باغ آباد ہوں گے لیکن جلد جان لو گے۔ ہوا مسکرائی—اور اڑ گئی۔

ٹونی یہ سن کر پُرسکون ہو گیا کہ اس کے ساتھی سلامت ہیں اور دوسرے باغ میں پہنچ گئے ہیں۔

کچھ دن بعد ٹونی تخم نے بزرگ بیج سے کہا، چچا! آپ تو کہہ رہے تھے کہ بیج غائب ہو کر پودا بنتا

ہے۔ ہمارے باغ کو دیکھیں، یہاں بہار کب آئے گی؟ میرے کتنے ساتھی غائب ہوگئے۔ لگتا ہے میرا بھی یہی انجام ہوگا۔

بزرگ بیج نے فرمایا، تمہیں اپنی فکر سے فرصت ملے تو کچھ اور نظر آئے۔ وہ دیکھو! ننھی ننھی کونپلیں زمین میں سر اٹھا رہی ہیں — یہ ہمارے ساتھی بیج ہیں۔ سبحان اللہ! کیسا روپ بدلا ہے۔

ٹونی تخم بولا، اور ان بیجوں کا کیا بنے گا جن کو پرندے کھا گئے —؟

بزرگ بیج نے کہا، وہ پرندوں میں توانائی بن کر اڑ رہے ہیں۔ اپنی زندگی دوسروں کے لئے قربان کرنے والا ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔

ٹونی تخم یہ سن کر چونک گیا۔ سوال پوچھنے والا تھا کہ کوّا آیا اور بوڑھے بیج سمیت چند اور بیجوں کو اچک کر لے گیا۔ ٹونی تخم خوف سے سمٹ گیا۔ اداسی بڑھ گئی۔ اس غم میں پریشان تھا کہ ایک ایک کر کے سب چلے گئے، میں کس کام آؤں گا؟ کیا مٹی مجھے قبول کرے گی؟ جب میں بھی مٹی میں چھپ جاؤں گا تو کیا پانی مجھے سیراب کرے گا؟ بے چین رہنے لگا کہ نئے روپ میں کب ظاہر ہوگا۔

ایک صبح آنکھ کھلی تو دیکھا سامنے درخت پر بیٹھا پرندہ اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ خوف محسوس ہوا۔ پرندہ اس کی جانب لپکا — آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہوش آیا تو خود کو مٹی میں موجود پایا۔ جسم زخموں سے چور تھا۔ آس پاس نظر دوڑائی — نئی جگہ تھی جہاں چھوٹی جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ویرانی دیکھ کر اپنا سرسبز باغ یاد آیا اور آنکھیں پانی بن گئیں۔ اتنے میں ہوا کا جھونکا آیا اور پیغام دیا کہ ٹونی، اب یہ تمہارا دیس ہے۔

پھولوں میں رہنے والے بیج کا گوبر کی بدبو سے دم گھٹنے لگا لیکن اس نے برداشت کیا۔ بدبو سے نڈھال ہونے لگتا تو دھوپ اور پانی اسے راحت پہنچاتے اور وہ کچھ دیر کے لئے اپنے زخم اور پرانے ماحول کو بھول جاتا۔

بارش کا پانی پینے سے زخم بھر گئے تھے۔ جسم پھول کر کئی گنا بڑا ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ آخر میں کب تک اس حال میں رہوں گا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جو بدبو میں آ گرا ہوں جہاں ہر طرف مٹی اور کیچڑ ہے، اور گوبر سے تو اللہ کی پناہ!

ایک روز اسے جسم میں تکلیف محسوس ہوئی۔ درد

میں شدت آئی۔ ایسا لگا کہ جسم پھٹ جائے گا۔ اندر میں کوئی شے باہر آنے کو بے تاب تھی۔ اتنے میں چٹخنے کی آواز کے ساتھ بیج کھلا اور تنا نکلا۔

بیج تکلیف میں تھا مگر اپنے وجود سے دوسرے وجود کو نکلتے دیکھ کر تکلیف بھول گیا اور راحت محسوس کی۔ تھوڑی دیر میں غنودگی چھائی اور وہ سو گیا۔

اب ٹونی تخم کی آنکھیں زیادہ تر بند رہتی تھیں۔ وجود ہر روز تبدیل ہو رہا تھا۔ خول ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل چکا تھا اور اس میں نکلنے والا تنا پودے کی شکل میں ڈھل گیا تھا۔

ٹونی کو حیرت ہوئی کہ جس خول کو میں اپنا جسم سمجھ رہا تھا، وہ غائب ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود مختلف شکل میں ظاہر ہے۔ اس میں سے ٹہنیاں در ٹہنیاں نکل رہی ہیں اور پتّوں کا ہجوم ہے۔

بادِ صبا کا گزر ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہا، نیا لباس مبارک ہو بھیا! اور اڑ گئی۔

کچھ دن بعد پودے پر سورج مکھی کا پھول نمودار ہوا۔ پرندے اور تتلیاں آس پاس چہچہاتے اور بچے اردگرد کھیلتے تھے۔ اس کے وجود نے ویران جگہ کو آباد کر دیا تھا۔ آخر ٹونی کو سمجھ میں آ گیا کہ میں ہی بیج ہوں، میں ہی پودا ہوں، میں ہی پھول ہوں۔ میں بار بار ان شکلوں میں ظاہر ہو کر غائب ہوتا ہوں اور پھر ظاہر ہو کر غائب ہو جاتا ہوں۔

پیارے بچو، آپ نے سورج مکھی یعنی 'سورج جیسا چہرہ' کہانی پڑھی۔ اندازہ ہے کہ آپ پڑھ کر خوش ہوئے۔ آپ بھی کوشش کریں اور پھولوں کے بادشاہ گلاب کے رنگ برنگ پھول سامنے رکھ کر غور سے دیکھیں اور کہیں — کہ بھائی گلاب! ہمیں اپنی آپ بیتی سنائیے۔ ہم سب بچے آپ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔

شاہ بلوط کے پھل کو اکورن (acorn) کہتے ہیں۔ یہ کئی پرندوں اور جانوروں کی مرغوب غذا ہے۔ گلہریوں کو یہ اتنے پسند ہیں کہ انہیں ذخیرہ کرنے کے لئے زمین میں دبا دیتی ہیں اور سردیوں میں نکال کر کھاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ گلہری پھل زمین میں چھپانے کے بعد بھول جاتی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور پانی مٹی میں چھپے اس پھل میں جاتا ہے تو پھل میں موجود بیج کھلتا ہے اور شاہ بلوط کا پودا ظاہر ہوتا ہے۔

بی بی ایمن

چار سوال ــــ جواب؟

چین کے ایک گاؤں میں تائی نامی ذہین لڑکی رہتی تھی۔ وہ کھیتی باڑی میں والد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ کھیت میں گھنا سایہ دار درخت تھا۔ تھکن دور کرنے کے لئے درخت کے نیچے آرام کرتی۔ درخت کی شاخوں پر پرندوں کے گھر تھے۔ دور دراز سے آنے والے پرندے کچھ دیر یہاں آرام کرتے اور درخت پر رہنے والے پرندوں کی مہمان نوازی سے خوش ہوکر اپنے آشیانوں کو لوٹ جاتے۔

پرندوں کی میٹھی اور سریلی آوازیں سن کر تائی کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ کاش! میں پرندوں کی بولی سمجھ سکتی کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ کیا یہ بھی مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں؟ ان کو معلوم ہے کہ میں انہیں دیکھ کر خوش ہوتی ہوں؟

وہ غور سے ان کی باتیں سننے لگی۔ تائی کو یقین تھا کہ ایک دن اسے چڑیا کی چوں چوں، کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پیہو سمجھ میں آجائے گی۔

ان دنوں سخت گرمی تھی۔ آج چڑیاں بے تابی سے چوں چوں چوں کر رہی تھیں۔ تائی بے چین ہوگئی کہ یہ کیوں پریشان ہیں۔ چوں چوں چوں کی آواز پر غور کیا تو ذہن میں پانی کی تصویر بنی۔ وہ فوراً پرندوں کے لئے رکھے گئے مٹی کے برتن کی طرف آئی۔ برتن خالی تھا۔ تائی نے پانی برتن میں ڈالا۔ جب تک وہ برتن کے پاس رہی، کوئی چڑیا نہیں آئی۔ تائی کے ذہن میں ایک اور تصویر بنی ــــ دیکھا کہ برتن کے پاس کھڑے ہونے کی وجہ سے چڑیاں پانی پینے نہیں آرہیں۔ وہ پیچھے ہٹی اور واپس جاکر درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر لیٹ گئی۔

تائی کا دل خوش ہوگیا جب پرندوں کو پانی کی طرف جاتے دیکھا۔ پہلے سب نے پیاس بجھائی۔ پھر کچھ پرندے برتن میں ڈبکی لگا کر باہر نکلے اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے پھرر.....ررر، اڑ گئے۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ میں تیزی آگئی۔ سب مل کر چوں چوں کر رہی تھیں۔ اب آواز میں بے تابی کے بجائے خوشی تھی۔ چوں چوں چوں چوں سن کر تائی کے ذہن میں ایک اور تصویر بنی۔

مفہوم کھلا کہ چڑیاں کہہ رہی تھیں.....

اللہ تم سے راضی ہو
اللہ تم سے راضی ہو

تائی کو احساس ہوا کہ چڑیوں کی آوازیں ذہن میں تصویریں بن کر ظاہر ہو رہی ہیں۔ وہ خوشی سے نہال ہوگئی۔ چڑیوں کی بولی سمجھ میں آ گئی تھی۔

تائی اپنے اردگرد لوگوں کا خیال رکھتی تھی۔ گاؤں میں ایک ضعیف خاتون اکیلی رہتی تھیں۔ سارا کام خود کرتیں۔ کہتے ہیں کہ آدمی، آدمی کی دوا ہے۔ ہر بندے کو دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بوڑھی اماں کو مدد کی ضرورت تھی لیکن خودداری کی وجہ سے کسی سے مدد کرنے کو نہیں کہتیں۔

تائی ان کی عادت سے واقف تھی۔ دن میں ایک مرتبہ ان کے گھر جاتی، سلام کرتی، خیریت پوچھتی اور باتوں باتوں میں کئی کام کر دیتی۔ بوڑھی اماں اسے بہت دعائیں دیتی تھیں۔

تائی کے گھر کے باہر میدان تھا جہاں شام کو گاؤں کے بچے کھیلتے تھے۔ کھیل کھیل میں کوئی بچہ زخمی ہو جاتا یا گرنے سے گھٹنا چھل جاتا تو گھر جانے کے بجائے تائی کے پاس روتے ہوئے آتا۔ وہ مرہم پٹی کر دیتی تھی۔ غرض تائی سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ اس کا دل بڑا اور ذہن کشادہ* تھا۔

تائی کی شادی اپنے گاؤں میں ہوئی۔ سسرال میں سب بڑھئی تھے۔ ان کا خاندان اپنے کام کے حوالے سے قریب دور ہر جگہ مشہور تھا۔ بادشاہ، وزیر اور امیران سے فرنیچر بنواتے تھے۔

شاہی دربار میں کرسیوں اور میزوں کا اضافہ کرنا تھا۔ کام کے لئے تائی کے سسر ٹینگ کا انتخاب ہوا۔ انہوں نے ہامی بھر لی اور دن رات خوب محنت کی۔ بادشاہ کو خوش کرنے کی خواہش میں اپنی سکت سے زیادہ کام کیا اور نیند کم ہوگئی۔ ایک روز تھکن کی وجہ سے کام کے دوران چکر آ گئے۔ خود کو سنبھالنے کے لئے ہاتھ قریب میز پر رکھا۔ میز پر گل دان تھا جو ہاتھ لگنے سے گر کر ٹوٹ گیا۔

دربار میں خاموشی تھی۔ گل دان ٹوٹنے کی آواز گونجی۔ خادم بھاگتے ہوئے آئے کہ کیا ہوگیا۔ ٹوٹا ہوا گل دان دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے کہ اب بڑھئی کی خیر نہیں۔ یہ بادشاہ کا پسندیدہ گل دان تھا جو پڑوسی ملک کے بادشاہ نے تحفے میں بھیجا تھا۔

* دوسروں کی خدمت کا جذبہ

بادشاہ کو خبر ملی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔غضب ناک آواز میں کہا، بڑھئی کو بلاؤ!

خادم ژینگ کو لے کر آئے۔

بادشاہ بولا، گل دان تم نے توڑا ہے؟

ژینگ نے کہا، بادشاہ سلامت! توڑا نہیں، غلطی سے ٹوٹ گیا۔ تھکن کی وجہ سے قدم لڑکھڑا گئے تھے اور میں خود کو سنبھال نہیں سکا۔

بادشاہ تخت سے اٹھا اور تلوار میان سے نکال کر نوک ژینگ کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا، جانتے ہو وہ میرا پسندیدہ گل دان تھا۔ تمہیں سزا ملے گی۔

ژینگ نے التجا کی، مجھے معاف کر دیں۔ وعدہ کرتا ہوں گل دان کی رقم ادا کر دوں گا۔

بادشاہ بولا، اس سے کیا ہوگا؟ کیا قیمتی گل دان واپس آجائے گا؟

ژینگ نے منت سماجت کی کہ خدارا مجھ پر رحم کیجئے، جو قیمت ہے، ادا کر دوں گا۔

بادشاہ نے تلوار میان میں ڈالی اور کہا، بہت خوب! جانتا ہوں کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ ممکن نہیں لیکن تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ دس دن کے اندر چار سوالوں کے جواب بتا دو تو تمہاری جان بخش دی جائے گی۔

ژینگ کی جان میں جان آئی۔ اس نے پوچھا، سوالات کیا ہیں—؟ میں جواب تک پہنچنے کی پوری کوشش کروں گا۔ بادشاہ نے سوال بتائے۔

۱۔ ایسی شے ڈھونڈو جو توے سے زیادہ کالی ہو۔

۲۔ ایسی چیز بتاؤ جو آئینے سے زیادہ شفاف ہو۔

۳۔ لوہے سے زیادہ مضبوط چیز کا نام بتاؤ۔

۴۔ سمندر سے زیادہ وسیع چیز کا پتہ لگاؤ۔

اگر ناکام ہوئے تو میں تمہارا سر قلم کر دوں گا۔

ژینگ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ پریشان تھا کہ اس کا پیشہ بڑھئی ہے۔ ان سوالوں کا جواب کیسے اور کہاں تلاش کرے۔ اچھا ہوتا کہ بادشاہ اسی وقت گردن اڑا دیتا۔ اب دس دن موت کے انتظار میں گزریں گے۔ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری مدد فرما!

محل سے گھر جاتے ہوئے راستے میں گہری سوچ میں گم تھا۔ گھر پہنچ کر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ کسی نے بات کی تو ہوں ہاں میں جواب دیا۔ کچھ کھایا نہ پیا۔ گھر والوں نے محسوس کیا کہ کوئی پریشانی ہے لیکن ژینگ نے کچھ نہیں بتایا۔

صبح تائی نے کہا، بابا! آپ کو کیا بات پریشان

کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم مدد کر سکیں۔

ژینگ بولا، بیٹی! دانا لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ بادشاہوں کی دوستی اچھی ہے نہ دشمنی۔ مزدوری کرنے گیا تھا، گل دان ٹوٹ گیا اور زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ بادشاہ چاہتا ہے کہ اگر میں اس کے چار سوالوں کے جواب دوں تو سزا سے بچ جاؤں گا۔

تائی بولی، اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ سوال بتائیں ہم جواب تلاش کرنے میں مدد کریں گے۔ انہوں نے تائی کو سوال بتائے۔

تائی نے سکون کا سانس لیا اور مسکراتے ہوئے کہا، جواب آسان ہیں۔ میں آپ کے ساتھ جا کر خود بادشاہ کو جواب بتاؤں گی۔

ژینگ کا خیال تھا کہ تائی تسلی دینے کے لئے ایسا کہہ رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے تائی ان کی وجہ سے مشکل میں پڑ جائے۔

انہوں نے کہا، بے وقوف مت بنو۔ ان چیزوں کا وجود نہیں۔ بادشاہ صرف مجھے اذیت دینا چاہتا ہے۔ اگر تم محل گئیں تو وہ تمہیں بھی سزا دے گا۔

تائی نے اصرار کیا، بابا! فکر نہ کریں۔ بھروسا رکھیں۔ ہم دونوں کل شاہی دربار جائیں گے اور بادشاہ کو جوابات بتا دیں گے، باقی اللہ ــــ جانے!

تائی کو مطمئن دیکھ کر ژینگ نے گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گیا۔

اگلے روز دونوں محل گئے۔ دربار لگا ہوا تھا۔

بادشاہ نے بڑھئی کو دیکھتے ہوئے کہا، لگتا ہے جلد مرنے کا ارادہ ہے جو دس دن پورے ہونے سے پہلے آ گئے۔

بڑھئی ژینگ اور تائی نے آداب عرض کیا۔

پھر تائی آگے بڑھی اور بولی، آپ جن سوالوں کے جواب جاننا چاہتے ہیں، وہ ہم نے تلاش کر لئے ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟

بادشاہ نے دھان پان سی لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے اعتماد سے متاثر ہوا۔ ہاتھ کے اشارے سے اجازت دی اور پوچھا، بتاؤ! وہ کیا شے ہے جو توے سے زیادہ سیاہ ہے ــــ؟

تائی نے کہا، ایسی سیاہ شے وہ دل ہے جس میں لالچ اور خود غرضی ہو۔

بادشاہ کو لڑکی سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا، آئینے سے زیادہ شفاف شے کون سی ہے ــــ؟

تائی نے جواب دیا، وہ شے علم ہے۔ علم دل اور دماغ پر لگی میل کو صاف کر کے راستہ دکھاتا ہے۔

ایسا راستہ جو شفاف اور سیدھا ہے۔

بادشاہ سمیت دربار میں موجود دیگر افراد جواب سن کر چونک گئے۔ بڑھئی حیرت میں تھا کہ میری بہو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں۔

دربار میں سناٹا تھا۔ آواز گونجی، اور لوہے سے زیادہ مضبوط شے کون سی ہے ــــ؟

تائی نے مسکراتے ہوئے کہا، محبت! بادشاہ سلامت! محبت۔ محبت سے زیادہ مضبوط کوئی شے نہیں۔ اس سے دنیا تسخیر ہوتی ہے، دل موم ہوتے ہیں اور بادشاہوں کے بادشاہ اللہ کی دوستی عطا ہوتی ہے۔ اللہ کے دوست کے ہاتھ میں لوہا پگھل جاتا ہے اور پتھر دل موم ہوتا ہے۔

چوتھے سوال کا جواب دیتے ہوئے تائی بولی، سمندر سے زیادہ وسیع وہ دل ہے جو اللہ کو حاضر و ناظر جانتا ہے اور انصاف کرتا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ژینگ کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور سر ادب سے جھکا لیا۔

دربار میں سکوت تھا۔ بادشاہ سوچ میں گم تھا۔

ذہین لڑکی نے بادشاہ کو جوابات کے پردے میں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

پہاڑوں کے دامن میں خوب صورت گاؤں تھا۔ گاؤں کے سامنے دریا بہتا تھا۔ اس گاؤں میں ایک ضدی بچہ رہتا تھا۔ اس نے اپنے ابو سے پوچھا کہ کیا میں دریا میں نہا سکتا ہوں؟ ابو نے کہا، نہیں بیٹا! آج نہیں، دریا کا بہاؤ بہت تیز ہے، ایسا نہ ہو کہ ڈوب جاؤ۔ بچے نے کہا، مجھے تیرنا آتا ہے، میں نہیں ڈوبوں گا۔ ابو نے منع کیا لیکن بچے نے بات نہیں مانی اور چپکے سے نہانے چلا گیا۔

بچہ دریا میں نہا رہا تھا کہ پانی کا تیز ریلا آیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن خود کو سنبھال نہ سکا۔ خوش قسمتی سے اس کا پڑوسی بھینس چرا رہا تھا۔ بچے کو ڈوبتے ہوئے دیکھا تو دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوبنے سے بچا لیا۔ بچے سے پوچھا کہ وہ اس موسم میں نہانے کیوں آیا تو اس نے بتایا کہ میں نے اپنے ابو کی بات نہیں مانی اور چوری چھپے آ گیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے کہا، مجھے نافرمانی اور ضد کی سزا ملی ہے۔ ابو کی بات ماننی چاہئے تھی۔

گھر آ کر ابو سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ میں ہمیشہ بڑوں کا ادب کروں گا اور ان کی نصیحت پر عمل کروں گا۔

(قدسیہ: جماعت سوم)

خواب تعبیر اور مشورہ

یونیفارم

ا،ب۔ ایک علاقے میں ڈیوٹی ہے۔معلوم ہوا کہ خاتم النبیین حضرت محمدؐ تشریف لا رہے ہیں۔ میں صاف ستھرا یونیفارم پہنے چوکس کھڑا ہوں۔ سوچا کہ جب حضور پاکؐ تشریف لائیں گے تو بہت ادب سے سلام پیش کروں گا۔سامنے نظر گئی تو لکڑیاں، تنکے اور گھاس پھوس نظر آئے۔ صفائی کا خیال آیا مگر یہ سوچ کر خیال رد کر دیا کہ یہ علاقہ میری ذمہ داری نہیں لہٰذا میں صفائی کیوں کروں۔ میں انتظار کرتا رہا مگر حضور پاکؐ تشریف نہیں لائے۔

تعبیر: خواب پڑھ کر آپ خود غور کریں کہ طرز فکر میں جانب داری یا غیر جانب داری، کون سا رخ غالب ہے۔

سیاہ اژدھے

ح ف۔ پتہ نہیں پانی کے ٹینک میں دو ڈولفن کیسے آ گئیں۔ایک نے میرے ہاتھ پر کاٹ لیا۔پھر دیکھا کہ گھر میں سات یا آٹھ سیاہ اژدھے آئے جن کا دہانہ پانچ سے چھ فٹ کا اور جسم کی طوالت 20 سے 25 گز ہے۔میں ڈر کر باورچی خانہ کی طرف بھاگی تو وہاں بھی اژدھے تھے۔میرے ہاتھ میں کوئی چیز ہے جس کی مدد سے ان کو گھر سے باہر نکالا۔ اژدھے سامنے والے پلاٹ میں چلے گئے۔محسوس ہوا کہ ہم میں سے کوئی باہر گیا تو اژدھے اسے نقصان پہنچائیں گے۔اس کے بعد دیکھا کہ گھر میں شیر آ گیا ہے۔میں شوہر اور بچوں کو کمرے میں بلا کر بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

تعبیر: غور سے پڑھیے۔

۱۔ آپ کو وسوسے اتنے زیادہ آتے ہیں کہ بات کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔

۲۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ گھر میں صفائی کا اہتمام ناقص ہے۔

ایک برائی یہ شمار ہوتی ہے کہ دوسروں کی برائی کا کھوج لگایا جائے اور وسوسے آئیں۔بہت اہم بات یہ ہے کہ وقت ضائع ہوتا ہے جب کہ یہی وقت کار آمد بھی ہو سکتا ہے۔اللہ تعالیٰ فضول خرچی کو پسند نہیں فرماتا۔وقت کا ضیاع بھی فضول خرچی ہے۔گھر میں باسی چیزیں زیادہ کھائی جاتی ہیں۔فریج میں رکھی ہوئی چیز بھی باسی شمار ہوتی ہے۔آپ نے جتنا سانپ

لمبا خواب میں دیکھا ہے اتنے ہی زیادہ دماغ میں reverse خیالات آتے ہیں ۔ آپ کو eye اسپیشلسٹ سے اپنی نظر بھی ٹیسٹ کروانی چاہئے۔

ٹخنا کاٹ دیا

نام شائع نہ کریں۔ تالاب میں چھوٹی مچھلیاں ہیں۔ایک مچھلی نے چھلانگ لگا کر میرا پیر منہ میں لیا اور ٹخنے تک کاٹ دیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ خون نہیں نکلا۔ میں اپنے کزن کے ساتھ اسپتال چلا گیا۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ حفظ و امان میں رکھے ۔آپ جو بھی کام کرتے ہیں، اس میں ہیر پھیر ہوتا ہے، وہ آپ کو پتہ ہے۔ٹخنا کاٹنے کا مطلب ہے کہ احتیاط کرنا ضروری ہے ورنہ .....!

روپ بہروپ

ث ع، کراچی ۔ کچھ خوابوں کی تعبیر میں آپ نے 21 روز کے لئے 313 مرتبہ درود شریف پڑھنے کی تلقین کی تھی۔عمل کے آخری دن دیکھا کہ پرانے گھر میں موجود ہوں۔ نانا کا انتقال ہوگیا تو لوگوں نے انہیں غسل دے کر کفن پہنایا اور میت کی چارپائی میں لٹا دیا۔ میں وہاں پہنچ کر کہتی ہوں کہ نانا کی وفات کا وقت نہیں آیا، وہ ابھی آسمانوں سے واپس آجائیں گے۔ پھر چارپائی کے پاس بیٹھ کر نانا کو جگاتی ہوں تو وہ آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ میں کہتی ہوں، نانا اوپر کیا دیکھ کر آئے اور کسی نے کوئی پیغام دیا ہے کیا؟ نانا کہتے ہیں، ہاں ! ایک معزز محترم شخصیت نے آپ کو سلام کہا ہے۔ میں کہتی ہوں، ہاں! میں نے یہی سنا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔

تعبیر: آدمی کی نیند اگر گہری نہ ہو تو مختلف صورتیں مناظر اور رنگ برنگ مخلوقات نظر آتی ہیں۔ جب کسی فرد کے ذہن میں الوژن کا ہجوم رہتا ہے تو وہ جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے وہ الوژن ہوتا ہے۔

خواب پر غور کیا جائے تو بیداری کے خیالات روپ بہروپ میں منظر کشی کرتے ہیں۔ اگر نیند گہری ہو تو روپ بہروپ یاد نہیں رہتا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ نیم غنودگی میں بہت سارے مناظر سامنے آتے رہتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب نیند گہری نہ ہو بصورت دیگر نیند میں جو کچھ نظر آتا ہے، ذہن میں اس کی تصویر تو بنتی ہے لیکن تصویر نمایاں نہیں ہوتی۔ سوتے ہوئے دیکھی ہوئی چیزیں بیداری کے خیالات کی ہلکی چھاپ ہیں۔ نظامِ کائنات میں ذہن کی حیثیت ریکارڈ کی ہے۔ اگر ریکارڈ دیکھنے میں گہرائی ہے تو دیکھی ہوئی چیزیں یاد رہتی ہیں یا کچھ یاد رہتی ہیں اور کچھ بھول کے خانے میں چھپ جاتی ہیں۔ آدمی شعور میں ہو یا لاشعور میں — دماغ ہمہ وقت مصروف رہتا ہے ۔ لاشعوری کیفیات ایک علم ہے جس کے معانی اور مفہوم ہیں۔ معانی اور مفہوم اس لئے واضح نہیں ہوتے کہ شعور کے مقابلے میں لاشعور

کی رفتار ساٹھ ہزار گنا بھی ہوسکتی ہے۔ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس میں عقیدت کا پہلو نمایاں ہے۔ زندگی میں الوژن کے نقوش زیادہ ہیں۔

ذرّہ تولا جاتا ہے

صبا ناز، کراچی۔ شوہر کے ساتھ چہل قدمی کر رہی ہوں۔ وہاں لان میں ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ شوہر سے کہتی ہوں کہ خوش نصیبی ہے کہ اللہ والے بندے سے ملاقات ہوگئی۔ پھر بزرگ کے قریب جا کر سلام کرتی ہوں۔ وہ مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ پھر دیکھا کہ لوگوں سے پُر ایک کمرے میں بزرگ کا بیان ہونے والا ہے اور میں دوسرے کمرے میں ہوں۔ جب بیان سننے کے لئے وہاں جا کر بیٹھنے لگی تو مجھے روک دیا جاتا ہے اور روکنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ راستہ ہے۔ ایک خاتون سے کہتی ہوں، سب اندر ہیں مگر میری جگہ نہیں بن رہی۔

تعبیر: آدمی ہمہ وقت دو بنیادی کیفیات میں رہتا ہے۔ دونوں کیفیات مقررہ نظام پر قائم ہیں۔ قرآن کریم میں ان کیفیات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے،

''پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔'' (الزلزال: ۷۔۸)

خواب اچھا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خواہشات قبول فرمائے، آمین۔ مستقل مزاج ہونا بہترین عمل ہے۔

تین طرح کا پانی

تحریم، لاہور۔ ملتان کے ایک بزرگ سے ملاقات کرنے گئی تو سلام دعا کے بعد عرض کیا، محترم! یا تو میرے شوہر کو صحیح کر دیجئے یا مجھے۔ بزرگ اس طرح مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں، کیوں نہ تمہیں صحیح کر دوں۔ پھر انہوں نے ایک کاغذ پر لکھا، 'اپنے گھر سے تین طرح کا پانی پیو' اور کاغذ مجھے دیا۔ میں عرض کرتی ہوں کہ میرے گھر میں تو ایک طرح کا پانی آتا ہے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: پہلی بات یہ ہے کہ خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ غصہ کھاتے ہیں یعنی غصہ نہیں کرتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے احسان کرنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ میاں بیوی کی آپس میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اس کا علاج ایک ہی ہے۔ بزرگوں کا فرمانا ہے کہ ایک چپ سو کو ہرائے۔

آدمی سانپ بن گیا

فائقہ شاہد، کورنگی۔ امی، ابو، خالہ اور باجی کے ساتھ بازار گئی۔ امی اور خالہ بازار میں ایک طرف گئیں اور میں باجی کے ساتھ چشمے دیکھنے لگی۔ ایک آدمی نے مجھے بندوق دکھائی تو میں نے باجی کو بتایا اور ان کے دیکھتے ہی وہ آدمی سانپ بن گیا۔ اتنے

میں ابو نے آ کر سانپ مار دیا۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ کوئی بیماری درپیش ہے۔ غصہ، جھنجھلاہٹ، اختلاف یا کوئی اندرونی شکایت۔ آپ کے والد صاحب نے سانپ کو مار دیا تو اس کے کئی پہلو ہیں لیکن ایک پہلو یہ ہے کہ آپ احتیاط کیجئے، خصوصاً کھانے پینے کی چیزوں میں — باسی کھانے، فریج میں 24 گھنٹے سے زیادہ رکھی ہوئی اور بازار کی چیزیں کھانا چھوڑ دیں۔ گھر میں اختلافِ رائے کی شبہیں ہیں۔ باقی اللہ جانے!

کیئر آف اللہ

جمیلہ۔ گزشتہ رات ایک پریشان کن خواب آیا جس کی وجہ سے میں گھبرا گئی ہوں۔ دیکھا کہ بہن بہت تکلیف میں ہے۔

تعبیر: اللہ تعالیٰ عیبوں کو چھپانے والا اور گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور بواسطہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا کیجئے کہ ہم سب کو کیئر آف اللہ سوچنے کی طرز عطا ہو۔ اللہ جو چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے۔ پریشانیاں عارضی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

بہترین عمل نماز

ا ع غ۔ دو دفعہ ملتے جلتے خواب آئے۔ ایک دفعہ دیکھا کہ اسلحہ بردار افراد نے میرے پلاٹ کے گیٹ کا تالا توڑ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ میری ان سے بحث ہوئی۔ دوبارہ دیکھا کہ قبضہ مافیا کے لوگ میرے پلاٹ پر موجود ہیں۔ ان سے تلخ کلامی ہو رہی ہے۔

تعبیر: مزاج میں تساہل اور لاپروائی زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں الوژن خیالات زیادہ آتے ہیں جو یقینی دنیا سے دور کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ بدظن ہونے کے بجائے یقین کی دنیا میں قدم رکھئے، انشاء اللہ ہمیشہ خوش رہیں گے۔

آپ کے لئے بہترین عمل نماز ہے۔ فجر اور عشاء کی نماز باجماعت پڑھئے۔ عشاء کی نماز کے بعد 100 دفعہ 'یاودود' پڑھ کر اپنے اوپر دم کیجئے۔

60,000

ا ح۔ ایک بزرگ خاتون ہمارے گھر تشریف لائیں۔ ہاتھ میں کھانے کے دو ڈبے تھے۔ ڈبوں کے اوپر ایک چھوٹی پلیٹ میں آٹھ یا دس کھجوریں تھیں۔ بزرگ خاتون نے برتن مجھے دیئے اور آسمانوں کی طرف پرواز کر گئیں۔

تعبیر: خوش خبری ہے کہ اولاد انشاء اللہ سعید ہوگی۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ تربیت کرتے وقت اللہ کے محبوبؐ کی حیات مقدسہ کا مطالعہ کیجئے۔ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر رات کو سونے سے پہلے درود و سلام پڑھئے اور سو جایئے۔ خواب

اصل ہے لیکن خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے یا بتایا جاتا ہے اس کے دو رخ متعین ہیں۔

ا۔ ایک رخ (رویائے کاذبہ) میں دنیا بھر کے خیالات کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے رخ (رویائے صادقہ) میں زندگی سے متعلق اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔

مثال وہ خواب ہیں جن کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بادشاہِ وقت کو بتائی۔ رویائے صادقہ میں چوں کہ حواس کی رفتار تقریباً 60 ہزار گنا ہوتی ہے۔ اس میں حالات حاضرہ سے متعلق اور مرنے کے بعد کی دنیا کی طرف متوجہ کرنے سے متعلق اظہار ہوتا ہے۔ خواب علمِ لدنّی کا ایک باب ہے۔ جس کے تحت حضرت یوسفؑ نے خواب سن کر مستقبل کے 14 سال کا انکشاف کیا۔ سات سال خوش حالی ہوگی اور سات سال قحط رہے گا۔ قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ اس کا بیان ہے۔

سیاہ آسمان

محمد ارشد علی، کراچی۔ ایک دوست نے مرشد کریم کا خطاب اپنے موبائل فون میں سنایا اور کہا کہ کیا ان الفاظ کے پیچھے چھپے معنی و مفہوم سمجھ میں آرہے ہیں؟ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ پھر کسی وقت دوست نے کہا، کیا تم صرف باتیں کرتے ہو۔ آؤ تمہیں کچھ

ماہنامہ قلندر شعور ستمبر 2020ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:............ والدہ صاحبہ کا نام: ....

پورا پتہ:............

ازدواجی حیثیت:............ وزن (تقریباً): .... آنکھوں کا رنگ ....

نیند کیسی آتی ہے:............ بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):............ تاریخ پیدائش:............

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟............ فون نمبر............

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : ....

....

دکھاؤں۔ یہ کہتے ہی منظر بدلا اور رات ہوگئی۔ سیاہ آسمان پر ہیروں کی طرح چمکتے ستارے ہیں، اتنا حسین منظر ہے کہ میں اس میں کھوگیا۔

تعبیر: بہت سارے خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں خواب دیکھنے والے کے خیالات تصویر کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ ذہن ماحول کے مطابق کام کرتا ہے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ اصل اور نقل میں امتیاز باقی رہے۔

چلّے

محمد عمر اکرم، لاہور۔ ایک صاحب کے ساتھ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تین درخواستیں پیش کیں۔ پہلی یہ کہ ہر عالم میں بزرگ کا ساتھ ملے۔ دوسری یہ کہ روحانی علوم میں ترقی ہو اور میں وہ بن جاؤں جو بزرگ بنانا چاہتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ کبھی بھی معاشی تنگ دستی نہ ہو۔ درخواستیں پیش کرتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: ذہنی یکسوئی نہیں ہے۔ اب تک چلّے جو کئے وہ کافی ہیں۔ شمار کئے بغیر کثرت سے یاحی یا قیوم پڑھئے۔ اس کے علاوہ رات کو پہلے 313 مرتبہ درود شریف پڑھئے اور بات کئے بغیر سوجائیے۔ مزید وظائف پڑھنا سکت سے زیادہ ہے۔

حسنِ رعایت

شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی خانقاہ میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز عقیدت مندوں کو حکم دیا تھا کہ خانقاہ میں لنگر کے لئے لائی جانے والی تمام اشیا روزانہ غریبوں میں تقسیم کردیں، کوئی شے بچا کر نہ رکھیں۔ ایک روز شیخ نظام الدین اولیاؒ آرام فرما رہے تھے کہ ایک شخص حاضر ہوا۔ اس وقت سائل کو دینے کے لئے خانقاہ میں کوئی شے موجود نہیں تھی۔ عقیدت مندوں نے شیخ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور سائل کو خالی ہاتھ لوٹا دیا۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ نے خواب میں پیرومرشد بابا فرید گنج شکرؒ کو دیکھا۔ انہوں نے فرمایا، ایک سائل آیا اور خستہ حال واپس چلا گیا۔ اگر دینے کو کچھ نہ تھا تو کم از کم 'حسن رعایت' تو تھی۔

آنکھ کھلی اور دریافت کیا کہ کیا کوئی سائل آیا تھا جو خالی ہاتھ لوٹا ہو—؟ صورت حال معلوم ہوئی تو ناراضی کا اظہار کیا اور حکم دیا کہ کوئی بھی مہمان آئے اس کو عزت کے ساتھ خانقاہ میں بٹھایا جائے، جو کچھ بھی موجود ہو، اس کی خاطر کی جائے اور پانی پیش کیا جائے۔

iii

began to expand and time unfolded itself as seconds, minutes, hours, days, weeks, fortnights, months, years, decades, centuries, eons and so forth. This forest, mountain, river, and sky that you see right now are space that are continuously unfolding out of time. The old tree you met has witnessed time unfolding as space within it.''

"The thought of God is like an entire book that is published in an instance. All the creations that existed in the past, in the present and those that will birth in the future were all created at the very instant God said, 'Be'. The Divine Author has created a perfect matrix out of all of us when He ordained, 'Be!' We are in the right place, right time, doing everything as per His will at all times. All the characters in the book are inseparable and will arrive and exit in sequence on the stage of life at the Divine commanded time. The sun will continue to rise from the east and set in the west, as He wills. The moon will orbit the earth, as He wills. The earth will orbit the sun, as He wills. Every single particle in existence is playing a role of great importance around others in perfect symphony." The master paused, took a deep breath of fresh air and continued.

"At the command of 'Be,' all the creatures separated into individuals. To make it easier to understand, imagine holding a folded Chinese paper fan. You will see nothing but tightly folded paper. When you begin to slowly open the paper fan up, you will notice that there are intricate designs on each fold of the paper. This is exactly what happened at the command of 'Be.' The dot unfolded like the open paper fan revealing each of us carefully crafted within its folds."

"The voice of God resounded within each creature and they heard Him ask, 'Am I not your Lord?' Here it is necessary to note that God had all the authority to command, 'I am your Lord,' but He asked us to express our choice of acceptance; and thus birthed 'Free Will', giving us the ability to choose between right or wrong, good or bad."

"What is the solution to the miseries of life?" he asked.

The master replied, "Mankind is aware of its miseries in this material life and most often die unaware that their real misery is failing to recognise their true self and Creator before death. Lack of faith is the foundation of all misery in life. A believer is one who has surrendered to God and places complete faith in Him in all matters. And when this is done, everything that happens in life will be accepted as the will of God and there remains no grievance or grief, no matter what one is put through. As we discussed, the lake has no qualms whether it overflows as a flood or dries up like a puddle."

(Episode 7)

long years it focuses on strengthening its roots. And in the fifth year, the seed breaks through the soil and begins to grow into a tree. It is amazing to note that these trees have been recorded to grow an inch every hour, about three feet in a day, and almost over ninety feet in a month. What do you learn from this?" asked the master.

"A student needs to be patient until they achieve self-awareness," he replied with a smile.

The master smiled back and said, "The seed has no idea whether it will sprout or grow into the tallest known tree amongst its species. It is the caretaker who needs to have faith and patience to water the seed every day despite seeing no noticeable results. The caretaker cannot give up and must persist in nurturing the seed till it sprouts. When the caretaker gives up, the seed has no choice but to give its life up and become top soil."

"Please forgive my ignorance my dearest master. Only you can see the potential of the seed of awareness you have planted in me. It is you who will be persistent in your care for me whilst I may or may never sprout in the way I should. I am grateful for your love and care." Feeling ashamed, he held his master's hand and kissed it.

The master lovingly stroked his head and asked, "Do you know how *Kohl* is made?"

He looked up and said, "Yes. An oil lamp with a thick wick is lit and a copper or brass plate of water is placed over the flame. The flame creates thick layers of soot, which is then scraped off gently and mixed with oil or *ghee* before it is ready for use."

The master smiled, "I have been pounded and crushed into fine powder to be *kohl* my son. It is up to you whether or not to apply me to dress your eyes." Saying this, the master stood up. He looked up at the master from where he was sitting; the clouds had drifted and the sun was emerging right above the master and the rays of sunlight beamed around him to form a golden halo.

"Who am I? Why was I created?" He asked.

"When God wished to be recognised, He created this universe. We are the reflection of the will of God. One can meet God within one's heart at all times."

He felt as if the mountains, winds and the river were drawing closer to listen to and absorb the master's words of wisdom.

"The creation of the universe gave birth to time. When time began to unfold, it became the 'space' we see around us. We can say this entire universe is encapsulated in a thought; a dot. At this point, you and I and this entire universe is one within each other, much like the hand-crafted Russian dolls that are built one inside the other. And when this dot in time was instructed to "Be," the dot

i

Circle of Life

"Indeed. Can you imagine a scenario where you are standing before a mighty emperor, totally ignorant of who he is? And to add to that, you are ignorant of your own identity too..."

He looked at the master who was now sitting in a meditative pose. The master suddenly spoke in a voice so powerful that it seemed like the entire valley, the mountains, the river, the sky and the pouring rain were reverberating in it. "The whole universe is in God's presence in every single moment. The veils of ignorance shield one from seeing Him."

"One will never be able to see *ghee* inside milk but can we deny the fact that *ghee* exists within the milk? Making *ghee* is a tedious process that takes many days of patience. One must boil milk every day, and then wait for it to cool down. When it cools down, a thick layer of milk cream floats up. One collects milk cream over many days till it is in sufficient quantity. A little curd is then added to the milk cream, and it is left to curdle overnight. The next morning, one churns the curdled milk cream till a lump of butter separates itself, leaving behind a thin fluid called buttermilk. The butter is then heated on a low flame till it melts and forms a golden liquid. The hot golden liquid is allowed to cool down so that the residue within it settles at the very bottom. This pure golden liquid that you strain is *ghee*."

The master paused and asked, "What did you understand from this?"

He felt a huge lump in his throat; swallowing his tears, he replied in a soft voice, "The stages of milk, to milk cream to butter to *ghee*, suggest the process of purification that my soul needs to undergo in order to lift the veils of ignorance."

"Indeed. Can you imagine a scenario where you are standing before a mighty emperor, totally ignorant of who he is? And to add to that, you are ignorant of your own identity too. What use is this meeting if one's eyes are veiled with ignorance?" the master asked.

"You must strive to know God. When you know that He loves you more than seventy mothers put together, you will ride the waves of the ocean of love God has nurtured you in." The master was looking at him.

He was unable to stop his tears. Though these tears were not of sadness, strangely, there was a lot of peace and tranquility in them.

"A spiritual student is nurtured like Chinese bamboo. The most remarkable fact of this plant species is that the seed is so hard that it takes five years of regular nurturing and caring for it to sprout and emerge from the ground. For five

grance is called aroma therapy.

When you are surrounded by a good smell, you instantly feel more relaxed and happier and as your sense of smell is a powerful tool for memories, it helps in unleashing positive experiences and makes you happy.

Stress Reduction

Plants provide a natural way of destressing people as they have a sense of peace around them. They do not mind your busy schedule and stay still while they constantly grow. Plants are patient and docile, and help to create that atmosphere within a home.

Rather than constantly feeling you are rushed by everyone else; you receive a calming effect around plants. Caring for plants becomes a positive way to channel stress and frustration into something that is beautiful and provides comfort and happiness. Watching the milestones of plant growth is very fulfilling and distracts a stressful mind as it focuses on the growth of the plant instead.

By being involved in watering plants every day, one eases out their negative feelings and begin to notice that their observation power has increased. They are able to notice new shoots, and budding flowers – all minute changes in their plants are now observed keenly.

Air Quality

Without plants, life on earth would be impossible. Through the process of photosynthesis, plants produce oxygen, as well as purify the air of the pollutants. When you have plants inside your home, the air is naturally cleaner and more beneficial for the occupants.

Plants absorb carbon dioxide and emit oxygen, reduce levels of certain pollutants such as benzene, and keeps the air temperature down.

More oxygen release results in our body working more effectively, and our brain feels less fatigued and cloudy; thereby releasing the right types of hormones which help our overall health.

Plants release almost all of the water they take into the air. Dry air can lead to irritation in the lungs and cause problems such as dry mouth and overheat, as our body needs as much moisture as possible. Plants offer the perfect way to add humidity back into the air.

"Who hath appointed the earth as a bed and hath threaded roads for you therein and hath sent down water from the sky and thereby We have brought forth diverse kinds of vegetation." (Quran, 20:53)

"And in the earth are neighbouring tracts, vineyards and ploughed lands, and date palms, like and unlike, which are watered with one water. And We have made some of them to excel others in fruit. Lo! Herein verily are portents for people who have sense. (Quran, 13:4)

iii

sues being codependent on each other, are less competitive and are more empathetic. In short, the nature of the calm, composed and friendly coexistence in the plant species is transferred to the humans that look after them.

Healing Energy

Plants have been used in the healing of innumerable ailments. Every part of a plant, be it roots, stems, leaves, fruits, or seeds, have been used in the treatment and cure of various diseases in mankind, and are known to have valuable medicinal properties. Research has been extensive on the healing properties of plants in recent times, especially when people are looking for more natural methods that are devoid of chemicals. Herbal remedies are simple and holistic and help treat common illnesses.

Crime Free Society

Being involved in horticulture is known to have played a great role in reforming people with a criminal mentality. Neighbourhoods with beautiful parks have less recorded rates of crime. As the parks are the heart of the community, people come together and get to know each other and become a tight knit community.

More community work is undertaken such as picking up trash, keeping walls free from graffiti, removing objects that can endanger people who visit, etc. You will most often see a lot of talent being encouraged in parks – musicians, artists, etc.

Ripple Effect

When one part of the community begins to improve their urban green spaces, neighbours hear the chirping sounds of the birds and see how the squirrels and other animals have begun to make the green space their habitat too and they follow suit. This is called the ripple effect when one action or event produces results which spread and have a series of consequences. The neighbours want to beautify their surroundings better than what they witness and this healthy competition, ultimately leads to a green country.

Communities with beautiful landscapes are correlated with a higher quality of life. These communities attract businesses and help in sustaining the economy of the community. Cities with more landscaping are known to attract tourists.

Happiness in the Form of Gifts

Plants make the best gifts. Flowers are known to represent a lot of emotions and are often used to express happiness and good will throughout the world. When one is in a space decorated with flowers, the colours and scent have a very soothing effect and reduce stress and make people happy.

Flowers are known to be visual stimulants and release happy hormones. Various perfumes are derived from flowers and the essential oils created from them are known to have healing properties. The healing through plant fra-

ii

one performs tasks under the calming influence of nature, they are more accurate and yield efficient results. Being in a natural, green environment is known to increase memory retention and concentration span by up to 20% as per the study by the University of Michigan. There are easy ways to implement this, such as increasing ornamental plants in your workspace both at home and at the office.

Interactive learning

Botanical garden trips have been great learning grounds for children and adults alike. These green spaces are known to raise awareness about the environment and help the younger generation to contemplate how to conserve nature around their cities.

People who repeatedly visit parks and gardens develop a keen liking towards gardening or farming and many go on to harvest their own organic food.

Research has shown that children who spend time around plants learn better. It also helps those children who suffer from Attention Deficit Disorder – lack of focus or concentration.

When you encourage children to adopt plants, they learn qualities of caretaking, compassion, responsibility and more. They learn about the struggles of survival and dependency, thereby creating a safer space and environment for the children to learn, making them more open to the tasks at hand.

The phytonutrients, chemicals found in plants, are believed to improve human health and fight off diseases and bacteria.

Healing at all Levels

Access to parks and forests have been positively correlated to increased rates of physical activity. Such people who exercise regularly are less susceptible to ailments and are more resilient against minor diseases. Parks and forests contribute to mankind by elevating their health at all levels – mental, physical, emotional and spiritual. Forests and green spaces are known to be the most effective spaces for achieving deep meditative states.

The Therapeutic Effect of Gardening

Gardening is known to be therapeutic for those who have undergone trauma or grief. When one assumes the responsibility of nurturing a plant, it fills in the void and emptiness that they face and helps them work through their issues and heal their wounds. It is noted that those who were engaged in gardening, recovered faster and reached a better psychological state.

Compassionate Relationships

Research has shown that those who spend longer periods of time around plants have the ability to build compassionate relationships. Those who learn to care for plants, learn to reach out to others, share deeper bonds, have no is-

i

The Positive Effects of Plants

When you encourage children to adopt plants, they learn qualities of caretaking, compassion, responsibility and more. They learn about the struggles of survival and dependency.

The next time you see plants, it will never be in the same old way, because according to a new study, living amidst vegetation can actually extend your lifespan. Yes! You heard it right! Plants have a significant influence on the quality and length of our life.

Researchers from Harvard T.H. Chan School of Public Health and Brigham and Women's Hospital analysed data of over 100,000 women for over eight years, from the year 2000 to 2008, to see if there was any potential link between plants and life expectancy. The results were astounding; those women who lived between the greenest environments registered about 12% lower rates of mortality than those who lived in homes with no or less vegetation around them.

The research had very interesting facts to share. The analysis of the specific causes of death among the participants showed that those women who lived in greener areas had 34% lower death rate for respiratory disease and a 13% lower death rate for cancer in comparison to those who lived in areas with less greenery.

The women surrounded by greenery not only enjoyed better physical health but also demonstrated lower levels of depression, and improved mental health, which played a great role in their life expectancy. Also, exposure to less pollution, increased opportunities for socialisation, and more physical activity may also play a crucial role.

Research further substantiated that the results were the same no matter what age group the woman belonged to or despite different ethnicity, race, and environment – rural or urban. In short, being surrounded by trees and plants can help women live longer lives.

One does not have to worry about being in a huge yard or settling in a green forest to achieve this. It is important to note that 84% of the participants in the above survey lived in urban areas. Urban homes can be transformed into green havens and environmentally sustainable places by developing a little of our green thumb, bringing the greenery indoors.

There are innumerable other benefits of having greenery around you which affects your quality of life. Here are a few of them listed for your understanding. Remember, that a greener world is the future for a healthier mankind.

Concentration and Memory

Studies have proven that when

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

There is a fixed proportion for every object in this universe. This fixation of proportion is destiny. When these values have been determined, a person is bound to spend their life within those limits and remain dependent on resources. If a person reflects on the situations and incidents they face, upon their occurrence and one's lack of control on them, they attain the knowledge of the prevalence of the command of the All-Powerful God over the entire universe.

Regarding destiny, Shah Waliullah (RA) said, "Remember! To have faith in destiny is the greatest of all types of goodness. The reality of this belief is that a person sees the wisdom of only One Power at work in the entire universe. Whoever gives place to this belief in their heart, has their focus rivet on those positions and stations that make them closer to God. They think of the world as an unreal object, a shadow that is bound to disappear. They attain the belief in their heart that all those actions which are thought to be committed by people as per their will, are in actuality, not carried out through their own will and intention.

An example of this is the image that is seen in the mirror. It is possible that a shallow observer views it as permanent, but you are well aware that it is just a reflection of a being."

Shah Waliullah (RA) wrote several books, including '*Hujjatullah al-Baligha*' and '*Fuyooz al-Haramain*'.

The special characteristic of the friends of God is reliance on God – to accept God as the Creator and Owner and to only turn to Him.

In his book '*Fuyooz al-Haramain,*' Shah Waliullah (RA) writes:

"I once asked a spiritual question to the Holy Prophet Muhammad (PBUH). I asked what was better for me in worldly affairs; to make resources a means of acquiring things, or giving up on them in the first place. As soon as I finished my question, a blanket of fragrance approached me, owing to me losing all interest in worldly means, my children, my home, and so on. Afterwards, it was revealed to me through *kashf* (revelation) that my temperament attains pleasure though worldly means, and is continuously in search of them. However, in contrast, my soul is inclined towards placing its reliance on God. This provides my soul with solace and my soul is a seeker of solace. Therefore, I became aware of the fact that my temperament and soul are in mutual conflict. It is a better practice for me to follow the guidance of my soul."

* The Book *'Ahsan-o-Tasawwuf'* is included in the curriculum of M.A Islamiat in Bahuddin Zakariya University, Multan, Pakistan.

V

Ramadan, making various excuses for it."

Shah Waliullah (RA) showed a clear and straight path of thought and reflection to people with disturbed thoughts. He said that God has blessed everyone with an enlightened conscience and He has created everyone upon a nature that knows obedience. However, people lose their way through the involvement of doubt.

"All kinds of praise is for the One God who has granted all human beings such a nature that has the capacity to accept Islam and guidance. He has made their natural disposition such that they can easily acquire the pure religion, the basis of which is ease and convenience. It is an enlightened and a clear way. However, people have opted for misfortune by falling into the deep pit of misguidance, owing to their own ignorance."

Shah Waliullah (RA) has defined *Tasawwuf* (Spirituality) in the following words, "*Tasawwuf* is the method of acquiring a close proximity to God; through this, the aim is for one to become aware of the relationship between the Almighty God and themselves, and hence gains cognition of Him. Through these practices and remembrances, the reality of *Ana* (the Self) awakens inside a human being, leading to a consciousness that is aware of the ultimate Truth."

The friends of God are the guardians of spiritual knowledge possessed by the prophets. Regarding the significance of the friends of God in the overall universal system, Shah Waliullah (RA) said, "God Almighty has created such people among the followers of the prophets who shall bear their knowledge and shall understand the secrets of the way of life proposed by them. They are honoured with the privilege of being representatives of the prophets of God, and even one member from this group is preferred over a thousand ignorant worshippers. They are regarded as 'Great Ones' in the kingdom of heavens and the universe prays for them. So much so that even the fish living deep under the water remain busy praying for them."

There are other worlds too, both before and after this one. Every person who has come here has their footprint in previous worlds. Those with insight observe this phenomenon. This is an Association with one's record or link from the past.

Shah Waliullah (RA) says, "The realm of *barzakh* (the realm of incorporeal beings) is such that a lot of things that are considered to be non-matter by the general public and are considered to be free of physical body and shape, are seen walking and moving around from one place to another. It is, however, another story that not everyone can see them through their inner eyes."

Following in the footsteps of their father, Shah Abdul Aziz's two sons, Shah Abdul Qadir (RA) and Shah Rafiuddin (RA), translated the Holy Quran to Urdu.

Shah Waliullah (RA) lived to see the reign of ten rulers. He was born four years prior to the death of Aurangzeb Alamgir and passed away during the reign of Shah Alam II in 1176 Hijri.

After the death of Aurangzeb, the great Mughal empire faced a downfall owing to the rise of different moral perils. The Marathas started moving to Delhi after acquiring a greater portion of it. When Shah Waliullah (RA) noticed the weaknesses of the Mughals, he invited the ruler of Afghanistan, Ahmed Shah Abdali, to fight against the Marathas. Ahmed Shah Abdali accepted the invitation and defeated them.

In that era, the social and ethical position of Muslims had faced a huge decline. Laziness, indulgence in luxury and comfort, dishonesty and other similar vices were rampant among them.

Not only did he continue to write and compile his work into books, he also undertook the task of ethical and social reformation. He attempted to end the divisions among Muslims and stressed on the importance of moderation. It was his desire to unite the Muslims so that they could become able enough to form a strong empire again.

"Succumbing to the desires of ego – it is one of the greatest diseases of this era where everybody blindly follows their own opinion and does so without giving any due thought. They follow God's commands and the secrets entailed within it as per their own understanding, and engage in debates with others on the basis of what they have understood. Each person is biased towards their own practices and criticises the ways of others. Fraud is rampant and truth has been concealed in this dust."

Due to the culture of the people at that time, the marriage of widowed women was viewed negatively. Shah Waliullah (RA) opposed this culture and also emphasised moderation in spending during times of both happiness and grief.

"O' children of Adam, you have lost your ethics. You are overwhelmed with cold heartedness and Satan has become a guardian to you. Women do not respect men and men have insulted women. The forbidden things give you pleasure and those which are lawful have become tasteless to you. O' children of Adam, you have adopted evil customs due to which your belief is no longer affixed to the straight path. There are some among you who are so busy in their business affairs that they miss prayers; while there are others who indulge in idle talk so much that they ignore prayers. You are also ignorant of *Zakat* (charity) and you do not fast in

iii

People were shouting, 'Kill this man!' Some people had sticks in their hands, while others held swords and knives. Some were empty handed and everyone was screaming in unison, 'Beat him! Kill him!'

The target of these people was Shah Waliullah (RA), who was peacefully offering prayers at that time. He finished the prayer without any fear and then looked around.

His followers said, 'You must leave for they are your enemies. God forbid, they might do something wrong. You should escape from the small door.'

He said, 'Do these people want to turn the house of God into a slaughterhouse? If my time has not arrived, no one from them can damage even a single hair of mine. And if the time has arrived, then everyone has to leave.'

The noise became louder, 'Catch him, he must not escape. He has created an innovation in the religion. His companions are also worthy of punishment!'

Amidst these noises, some people entered the yard of the mosque.

Shah Waliullah (RA) asked, 'Have you come to kill me?'

A rebellious man said, 'Yes, you are not worthy of being left alive!'

Shah Waliullah (RA) replied, 'What is my sin?'

The man replied scornfully and with disgust, 'Are you unaware of your sin? Now, I will speak to you with disrespect. Have you not translated the Holy Quran to Persian? Is this not disrespect?'

Shah Waliullah (RA) became angry upon hearing this, raised the stick in his hand and said aloud, 'Allah Hoo!'

The effect of his call was so great that Shah Waliullah (RA) and his companions were able to leave the mosque one after the other as the crowd fell into a panic.

When Shah Waliullah (RA) reached Khari Baoli street, someone said, 'Make sure this imposter does not leave.' But this fell on deaf ears as the people stood rooted like idols of stone.

When Shah Waliullah (RA) reached home, Shah Abdul Aziz (RA), who was very young at that time, hugged his father and started crying. The news of this interaction between Shah Waliullah (RA) and his adversaries spread across Delhi.

Shah Waliullah (RA) said, 'Son, do you not know the type of torture that has been inflicted upon our Prophet Muhammad (PBUH) by these worldly men? Wipe your tears. I will soon depart, and it is you who has to take care of the inheritance of knowledge that I leave behind.'

The son lowered his head and replied, 'Whatever God wills! If God wants me to serve in this way, surely I will spend every moment of my life in this service of practice and knowledge.'"

Book: *Ahsan-o-Tasawwuf* *

is reproduced below:

"One should teach the great Quran by stressing that it should be read along with its translation. When one encounters difficulty in understanding the meanings of the words, they must pause, look for the meaning of the word and reflect upon it. This helps in developing an understanding of difficult words. Moreover, in order to understand the meaning of the Holy Quran, one should be in constant practice of prudence and reflection. Keep yourself occupied constantly with this routine. This method of teaching, indeed, becomes a source of abundant grace."

After a period of twelve years spent engrossed in teaching and learning, Shah Waliullah (RA) visited the Holy *Kaaba* in 1143 Hijri. Though he stayed in the Holy Land for a whole year, most of his time was spent in Medina. He acquired both material and spiritual knowledge from his teachers, especially Sheikh Abu Tahir Madani (RA) from whom he also acquired the knowledge of Hadith.

In the book '*Fuyooz al-Haramain*', Shah Waliullah (RA) has explained his experiences during his stay on the Holy Land. Under the title *Akhri Mushahida* (Last Observation), he writes:

"I entered the Holy *Kaaba* and focused on my inner self, and witnessed the reality of the straight path. Once, while describing the reality of the straight path, the Holy Prophet Muhammad (PBUH) drew a straight line and then on either side of it, began to draw more lines. At last, he said, 'The middle line is the straight path.' In short, the reality of the straight path manifested itself upon me in the Holy *Kaaba* and I saw that in between the states and situations of human souls, lay its reality. The straight path is attained by persistently obeying the commands of God."

It was common for Shah Waliullah (RA) to first read the Quran to his students before teaching them. This would assist in inculcating the meaning of the verses in their minds.

Shah Waliullah (RA) translated the Holy Quran to Persian. It was given the title of *Fatah al-Rehman*, owing to the fact that it was the first ever Persian translation of the Holy Quran in the Indian Subcontinent. After its translation, his adversaries made a lot of noise and passed a decree for his assassination.

Qalandar Baba Auliya (RA) described an incident relating to Shah Waliullah's (RA) son, Hazrat Abdul Aziz Muhaddith Dehlvi (RA), in a spiritual analogy. It is as follows:

"The congregation for *Asr* prayer was ready in the Fatehpur Mosque of Delhi. The Imam had just initiated the prayer when a noise was heard from outside.

i

The Seeker of Peace

There are other worlds too, both before and after this one. Every person who has come here has their footprint in previous worlds. Those with insight observe this phenomenon.

Revered saints state that the growth of a tree is dependent on its foundation, and the quality of a grain is determined by its seed. In the same vein, august children are born to august parents. Shah Abdul Raheem (RA) is a prominent name in the field of mysticism and Shah Waliullah Muhaddith Dehlvi (RA) is his son.

It is written in the book '*Anfas al-Arifeen*' that he was conferred the name Qutbuddin due to the prophecy from Khwaja Qutbuddin Bakhtiar Kaki (RA). Due to his saintly mannerisms and ethics, people referred to him as the friend of God. This name became popular and soon it became the talk of the town.

Born in Delhi, he was remarkably brilliant in his childhood. He was well read and had covered many books by the tender age of fifteen. However, his father got him married that same year.

He has spoken about his marriage in the following words, "My father was in great haste to get me married. Even when my in-laws tried to delay the ceremony stating the lack of time for wedding preparations as a reason, my father unrelentingly said that his insistence was not without reason and therefore, the wedding was to be conducted without any further delay. A few days after the wedding ceremony, my mother-in-law and my wife's maternal grandfather passed away and right after this, Fakhar-e-Alam, the son of a respected elder called Sheikh Abdul Razzaq (RA) followed suit. We had barely time to recover from our loss and my stepmother passed away too. Thereafter, my father became ill and suffered from multiple diseases, leaving us for his heavenly abode. As far as we could comprehend, this was the reason behind his haste."

Before his passing, Shah Abdul Raheem (RA) appointed his son as his successor and said, "After me, consider his hand as my hand."

Shah Waliullah (RA) acquired worldly and spiritual knowledge from his father. Shah Abdul Raheem (RA) taught his son to recite and reflect on the Holy Quran. Shah Waliullah (RA) said, "One of the greatest blessings of God upon me is that I had the opportunity to study the Holy Quran from my father numerous times. It is this learning that earned me great success. The path leading to understanding the Holy Quran was opened for me."

In his testament, he urged people to reflect on the Holy Quran. A brief extract from his testament

iii

Explaining the philosophical view of things, and helping us find logic, they coax us to let go of what is not serving us. They hope that we are able to see an alternate point of view in our story and let go. However, even when we understand the greater scheme of things and how that which traumatised us worked towards our transformation, we discard the suggestions and return to our comfort zone.

We do not let go of the noisy drum because the ego has not been satisfied and avenged. This is the stage where we feel like victims, giving rise to anger and we play the drum with all our aggression and might. Anger makes us believe there is nothing for us to be introspective of in the situation, and we try to reform those who have caused us pain instead.

We also try to counter advise our well-wishers and justify our actions instead of fixing ourselves. When people do not understand us, we shut them out, or buy them out with justifications.

Finally, by refusing to give up on our favourite story, we come to a point where we successfully sabotage everything we have in our lives. When we are at the threshold of losing it all to the compulsive thought disorder and slip into depths of depression, negativity, loneliness and sadness, more often than not arrives a ray of help from God in the form of a spiritual master or guide.

Let us now see the boy with the drum as a potential spiritual student. The first thing that the master does is that he offers a hammer so that he may shatter the illusory bubble of misery (drum) the boy carries with him. The spiritual master then encourages him to look inside the misery that he is holding dearly close to his chest, and observe how hollow the thought or story that bothered them is.

It is now that the student realises that it is the hollowness within the story (drum) that is contributing in the making of loud noises. As they say, empty vessels make the most noise and an empty mind is the devil's workshop. This hollowness lights the lamp of awareness in a student, and they begin to pay close attention to their spiritual master.

A spiritual master then very carefully removes the negative thinking pattern that the student was holding on to by engaging them in a new direction of thinking. The first step of unlearning thus begins. Once a spiritual student is on a continual process of unlearning, they begin to destroy all of their hoarded memories.

Over time, once the log of carefully accumulated stories become empty, the student has no reference point other than the teachings of their master. When one's spiritual master becomes their only point of reference, they feel light, happier and blissful. The misery and noise that shrouded their mind is now gone and they are free.

ii

towards the boy and the father, but after a few days, they went back to feeling angry and upset with them. When this did not work for long, the boy's father brought in a person who could conduct group meditation for the neighbours and soothe them. However, each of these remedies were short lived, and eventually, the neighbours went on to complain again.

Eventually a Sufi master heard about the case and walked into the room where the boy was still at his drum. He offered a hammer to the boy, and with eyes full of curiosity said aloud, "I wonder what exists inside the drum?"

That was the last of the drum that people ever saw. The boy cried for a while realising he had destroyed his drum; but soon, he forgot all about it and was found running around in happiness.

This is a very fascinating story and unravels a lot of insights on the behavioural traits of mankind and its impact on one another. Let us now understand the story in detail. Most of mankind is holding on to at least one preferred drum. Here, by 'drum' we refer to that one or few of our life experiences that we have stored in our long-term memory, which we relay as our favourite story constantly with everyone we meet.

For example, the story could be about how one endured a tough childhood, or how one had to face repeated failures in life, or how one was betrayed by close friends or family, etc. The list of stories is endless. We are so obsessed by the story of what happened to us that we begin to repeat it over and over again to everyone we meet, and speak about it day in and out until we make it part of our identity. After a while, people around us are unable to see us without the filters of our story. The result is that we eventually become synonymous with the stories we constantly tell ourselves and others.

This constant sharing about our past, can be paralleled to the obsessive drumming by the boy. When the effect of the stories gets out of control, we begin to spiral into negativity and the people around us, try to wean us off just like the various relatives who offered solutions to the boy. Initially, they try to bring awareness about the consequences of holding on to the stories and negative thoughts. However, we turn a deaf ear to the goodwill and continue to weave the old yarn.

As a next step of reform, well-wishers offer to keep us distracted from our destructive obsession. They invite us over for dinners, offer us to join them for outdoor activities or gift us something so that we are distracted and go on to embrace change. Though we happily accept the offer and have a good time temporarily, we discard these solutions in time, and conveniently slip back into our habitual thinking.

When we fail to understand, family and friends try the next prominent step, which is to heal us.

i

The Drum

We are so obsessed by the story of what happened to us that we begin to repeat it over and over again to everyone we meet, and speak about it day in and out until we make it part of our identity.

Once upon a time there was a little boy. On his fourth birthday, his father gifted him a small yet powerful drum. The boy was so delighted with his gift that he became inseparable from it. He beat the drum all day with a lot of force and never seemed to be tired of it.

After a while, the noise began to irritate those around him and they attempted to coax him to let it go or find a way to have him rest it for a few hours. But no matter what they said, the boy would not put the drum down and continued with his drumming even more ferociously.

Many well-wishers were summoned to convince him. A neighbour decided to intervene first and said, "If you continue to drum and make noise, you will perforate your ear drums and lose your ability to hear." The boy did not understand the neighbour's advice as he was still very young and the matters of science were far beyond his understanding. He smiled and continued to drum faster and stronger than ever. The neighbour left him to it, unable to bear the loud noises.

Next arrived a close relative of the boy. The man told the boy that drums should be played only during special occasions and festivals. The boy again did not understand what he was being told and without even looking up at his new advisor, he moved to the corner of the room and drummed feverishly. Having failed, the close relative left the boy alone.

A distant uncle walked in next and gifted him a colouring book. The boy looked excited for the first time and extended his hand to accept the book. Just when hopes rose amongst the neighbours who had gathered to watch this unfold, the boy thrust the book down upon the floor and continued with his drumming. Exasperated, they all complained to the boy's father and urged him to find a solution as soon as possible.

The boy's father helplessly pranced around and finally came up with a solution. He went to the market, bought ear plugs and offered them to his neighbours to cut out the noise pollution. It seemed to work well for a few hours, but then it was back to square one. Not everyone was comfortable wearing the ear plugs and even if they were, the drumming was so loud that they could still hear it.

The boy's father had to face the wrath of his neighbours now and so he brought in a philosopher who preached to them about love, kindness, acceptance and introduced them to anger management. The neighbours softened a little

V

When we look at our surroundings through individual filters, we feel we live in a world full of shapes, textures, patterns and dimensions. We are under the impression that we are interacting with them and feel the depth, temperature, size, texture and weight of things around us.

But what if this experience of space, time and depth is all an illusion? What if the solidity and shape of this universe around us, is in fact, a well-planned illusion produced by our brain?

When we dream in our sleep, we are convinced, that they are really happening to us. But then we wake up relieved that our experience was only a dream. Are we sure that our experiences in the wakeful state are not dreams too? What if the wakeful state is also a dream from which we will wake up and see this whole universe as nothing but a projection of light?

We believe that this separation is real and it develops the concept of 'You' vs. 'I'.

If man goes back to realising his point of origin as child of Prophet Adam and mother Eve (PBUT) and going even back and remembering that his soul is due to the command of God, then he will realise that despite being diverse, we are all united.

The Divine knowledge is constantly descending upon us as inspiration. How we interpret the inspiration that we receive defines our contribution in the universe. We can interpret this thought and become destructive or constructive. We all wake up with equal opportunity everyday to experience this universe, and we can fill it either with love or hatred.

We can progress individually or make progress a collective effort. We can hold one another in a tight embrace of unity or nudge every shoulder and elbow to race ahead of each other.

The choice we make in every moment defines who we are and what a world we, and the generations to come, will live in. The solution is for man to activate his inner vision and see the world from a unified perspective of being a soul. From where man sees his existence, brings in unity or diversity in this world.

"You think of yourself as a citizen of the universe.
You think you belong
to this world of dust and matter.
Out of this dust
you have created a personal
image,
and have forgotten
about the essence of your true
origin"

— Maulana Rumi (RA)

facing the light in the projector is the unfolding of time.

- The lens through which the light is filtered and spread upon the screen is, space.
- The stream of light before it hits the screen is the field of *Nasma* (prime matter) of the creations.
- The image on the screen is the physical body projected by the soul.
- The screen is earth.

We are all made from Divine light, but each of us at the point of physical manifestation differ from one another due to the different proportions of light within us. And this difference in proportion makes us all unique.

We can best explain it with an example of zooming into a picture. When we zoom in, we notice that the picture though is one, is made up of many individual pixels that join together to make it a whole. Each pixel that looks like a tiny dot of colour and different from the dot that lies next to it, will always be an integral part of the whole picture.

But, why is a dot or man unable to see himself as part of the whole matrix? As a dot of colour, he only encounters with boundaries of separation from the other. But what if he learns to rise over his existence as the dot and move upwards and see the whole image from an aerial view? He will surely not be able to differentiate himself from others. The higher he rises over the dot of individual existence the more blurry the boundaries will get and after a point he will not be able to see the pixels and only see everything as one and whole.

This ability to see our self from an elevated position is called as the process of ascension of mankind. A state where man realises his existence is not as a body, but soul.

The beloved prophets of God have come over time to remind mankind of their unified existence and repeatedly pushed them to rise over their existence as individual pixels in the image and see the whole picture from the eye of a soul or their inner vision.

The inability of individual consciousness to access its collective consciousness is due to the filters that man has created. The rigid filters within each individual, is in their thinking pattern. The opinions, stories, beliefs, value systems and interpretations that one stores within themselves, make them inflexible, unwilling to change with no easy acceptance of things.

The thinking pattern of mankind surely needs transformation. It has to be rebuilt to accept things as they are without a filter of individual interpretation. If we learn the art of interpreting the Divine interpretation as it is, we will all act alike without difference of opinion.

iii

"It is He who created you from a single soul, and therefrom created his mate that he might take rest in her." (Quran,7:189)

To understand unity, it is important to understand the point at which the unity turns into diversity. And the diversity seemed to be at the point where the collective consciousness responds to the thought inspired by God as individual consciousness. Comprehending the process that takes place for a thought to become a manifested creation, is as follows.

- Perception is the first stage in the comprehension of information.
- When perception deepens, it becomes sight.
- A subtle shadow reflects on the mind and the image concealed within, begins to surface.
- As the image takes up a form, it begins to speak, hear, see and move.
- Seeing through the waves is tantamount to feeling an image.
- The act of seeing and feeling the image is consciousness.
- The core of consciousness, are waves.

Analysing the above process through the example of the projector, we are posed with the following questions, "What is the law operating behind the process? Light rays shine upon the movie screen to produce diverse images from a single beam of light, and this is what we see as moving pictures. How are these clear and moving images produced?"

The thousands of images that make up a movie are stored on a long piece of film, which is wound on a reel and runs continuously through the center of the movie projector.

Behind the film is a very bright lamp fitted inside a concave reflector. The white light from the lamp is concentrated upon the film through the two lenses called as condenser. The images on the film act like a series of multicoloured filters. This filtered light, carrying the image on the film, passes through a series of lenses, which spread the light out and focuses it upon the movie screen. The screen then reflects the light, which forms images that our eyes see. The projector feeds 24 separate images past the lens in every second while a shutter flashes each of these images onto the screen three times. That is, 72 images are projected in every second. This flash rate is so fast that our eyes do not notice the images flickering on the screen, which creates an illusion of movement in the otherwise still images.

When we begin to draw parallels between the metaphor and the process we can deduce,

- The image on the film reel is the Divine will at the point of '*Kun*'.
- The portion of the film reel

ii

uled classes and attend some valuable documentaries. We would all sit huddled close to each other on the floor and giggle with excitement watching the assigned person fixing the film reels on to the projector.

When the whirring sound of the projector would fill the room, we would go absolutely silent in anticipation of what could be next. I distinctly remember the sound of the projector would come first into our awareness and it almost instantly made all of us turn our heads in the direction of the sound and then on a click, the projector would beam a strong stream of light, and our eyes instinctively followed the light.

After a few seconds, as soon as the light would hit the white screen or wall, we would see pictures, moving and unfolding into a mesmerising movie. Then on, we remained entranced separately oblivious of all around us, each in our own bubbles of imagination and feelings until the projector was switched off.

This memory reminds me of the first instance at which the creation met and became aware of their Creator, God Almighty.

"And when thy Lord brought forth from the Children of Adam, from their reins, their seed, and made them testify of themselves, (saying): Am I not your Lord? They said: Yea, verily. We testify. Lest ye should say at the Day of Resurrection: Lo! of this we were unaware." (Quran, 7:172)

All creations were at the point of unity when the voice of God commanded them to testify. The creations at first heard the voice of God, and their sense of hearing was activated. They then turned towards the direction of the voice and saw God, activating their sense of sight. Upon seeing the most Exalted God, they then testified activating their sense of speech.

We were all united in creation, hearing, sight and speech as we acknowledged God as our Lord. At what stage did we become diverse?

Let us now bring back our focus on to the stream of light beaming from the projector. We notice that all the images that were united at the point of projection as light seemed to disperse and become separate images as they hit the screen. All souls originated from the command of the Almighty.

As we are all sons and daughters of Adam and Eve (PBUT), we unfolded over time seemingly diverse as cultures, nationalities, religions and more and forgot this point of unity. The reality of unity of origin cannot be denied as it is stated in the Holy Quran,

"O mankind! Be careful of your duty to your Lord Who created you from a single soul and from it created its mate and from them twain hath spread abroad a multitude of men and women."

(Quran, 4:1)

Unity in Diversity

The thinking pattern of mankind surely needs transformation. It has to be rebuilt to accept things as they are without a filter of individual interpretation. If we learn the art of interpreting the Divine interpretation as it is, we will all act alike without difference of opinion.

"Is there anyone who contemplates what the sky is? The sky is free from dimensions. The Divinity guides those who muse over it, that what they otherwise deem as a tangible canopy, is in actuality a combination of lights. As light cannot be perceived by the confined senses, when one looks at the sky with limited consciousness, their vision fogs up. This obscurity is then perceived by them as the sky."

As one reads these enthralling words by the Spiritual Scholar Khwaja Shamsuddin Azeemi, one begins to wonder about the universe and how it unravels its mysteries upon those who attempt to seek them.

Mankind seems to feel safe in the assumption that dimension (world) exists only as far as our sights go and there is nothing beyond what we can see. But is this true? So there indeed was another dimension hidden within what we call dimensionless! As we say – A whole new world that we can explore. No matter how much we blink and hope for the fog to disappear from our eyes in order to be able to see the whole reality in its grand splendour, it is surely not an easy task accomplished at the blink of an eye.

One then realises that it is not just the sky. Many a things such as our beliefs, opinions, experiences, memories, perceptions; in short our thoughts create the thick fog between the reality and us.

This brings our focus on 'thoughts'. The thought has power to bring us closer or distance us from everything. Should not we then try to discover what a thought is? The Sufi Master writes that, "A mind stores nothing but images, and the one whose mind bears the images is the one who causes movement in them." He then adds, "And the universe is the reflection of the will of God."

The universe is a thought of God, and He is the creator of movement in it. This movement, a result of His will, is the life we live on each realm. Each creature is a thought of God that manifested as an image at the command of "Kun", and then the subsequent images overlapped making their individual life a flipbook that would slowly unfold itself over time. To summarise, the universe and its creatures are God's will, unfolding as time and space.

While on this concept, I remembered my visit to the school projector room. It was rarely that we were allowed to miss our sched-

unaltered, it can shape itself into other complicated disorders like schizophrenia and other personality and mood disorders. The cause, however, will always be simple – thought.

The cure to an inferiority complex is as simple as the cause. Any disease in the body left untreated grows stronger with time; similarly, any mental illness or disorder left unaltered grows powerful too, and may take different shapes of perceived complication. A point to consider is that individuals spend too much time rearing thoughts, taking in stimulus physically and psychologically from their environments to their brains. However, very little is done on their parts to organise the stimulus and calm their thoughts, and hence the result is rarely ever pleasant.

The more stimulus one is subjected to, the more their mind needs to organise it. For example, if we keep piling a bookshelf with books, without organising it, our space will run out very soon, and we will no longer be able to capacitate more books. Similarly, due to hoard of thoughts that we encounter with the added stimulus that we feed our brains every day, the dire need of organisation arises.

Practiced for centuries, meditation is a simple cure to many psychological problems, which may be connected to anxiety and a stampede of negative thoughts. One is required to take a position, preferably sitting down on the floor cross-legged, which should keep the spine erect. The place where one meditates is preferably dark or as lowly lit as possible. One is then required to calm their breathing with their eyes closed, and the hoard of thoughts that usually rushes in should be allowed to flow. Their focus throughout the meditation should be a state of peace, free of any thought; this state of mind can take a few weeks or even months to achieve as our minds are untrained to be at rest. This practice is required to be punctually practiced at the same time every day, for ten to fifteen minutes for observable results.

Keeping the spine erect keeps one awake and conscious. As meditation is an exercise of the conscious mind, the mind then gradually learns to rest and organise the hoard of thoughts and stimulus that it encounters every day. The state of peace, which the mind then explores, is seen to be a world in itself.

Observable results after only weeks of meditation might include vivid dreams, a sense of control over oneself, a concentration span that remains intact for longer duration, positive thoughts and an optimistic view of the world. Individuals who practice this may tackle problems of varied natures more efficiently, or they may feel more emotionally regulated, which is the better control over anger and other emotions.

Hence, any exercise or practice which focuses on the organisation of thought is helpful in the treatment of mental and physical problems alike.

iii

that in a consumerist society, luxuries are highly valued, and the race to achieve a high standard of living not only affects parents but subconsciously reflects on children too. After reaching a certain age, parents expect their children to have achieved something, which is mostly evaluated through material ownership such as properties, an expensive way of life and academic achievements. Failure to fulfill a parent's expectation brings backlash from them, which can damage a child's self-esteem, and further promote a negative thought process within them.

An individual with feelings of inferiority tends to exhibit their damaged self-esteem with a lack of belief in their skills and talents. Their past experiences are too unpleasant in their view. The chain of negative thoughts disallows them from hope; hence a pessimistic view of the world is commonly encountered.

A damaged self-esteem also promotes asocial behaviour – behaviour which is solitary and enjoyed alone, with a small number of people but often no people at all. A continuous chain of negative thoughts produces feelings of sadness and loneliness, and the individual feels frustrated most of the times due to self-concealment, which is the concealing of thoughts, emotions and feelings, and even concealing unimportant pieces of information from other people. Doubt and uncertainty is also a common characteristic, as this negative thought pattern gives birth to trust issues, and an individual may face difficulty in forming new relationships.

An important characteristic of positive thought pattern is focus and direction in thought. An individual with a positive thought pattern will portray direction and concentration in his or her actions, because of which difficulties will be better overcome and problems will be optimistically dealt with. Whereas, an individual with a negative thought pattern will face difficulty overcoming even minor problems, and may portray anxiety and restlessness in their behaviour.

Attention seeking behaviour can be a wide range of actions that are prominently different from the normal behaviour of an individual, such as, sudden upsurges of friendliness or hatred, joy or sorrow for no apparent reason. In addition, a self-ridiculing attitude may also be exhibited by an individual with feelings of inferiority.

Incidents in everyday life can at times produce feelings of inferiority or low self-esteem in us. But with time, we normally outgrow these feelings and optimistically break out of negative thoughts before they strengthen. An individual with feelings of inferiority, however, accepts negative thought pattern to the point where it starts to hinder their growth in all of their circles. Academically, the individual may become weak, socially; the individual may deal with weakened relationships, professionally; they may suffer from regression.

If an inferiority complex is left

ii

The later years of adolescence and adulthood are merely the exaggeration of one's childhood.

Human civilisations tend to run on a number of norms; a significant norm on which the human society bases itself is interaction. Interaction can have healthy effects or vice versa. For example, too much criticism, from primary agencies initially or secondary agencies including work relations or friends, produces a feeling of inferiority. Prolonged criticism, if left un-countered, leads to negative feelings of hopelessness and demotivation, and the growth of these two gives way to depression. Simplifying depression – the core of one of the most famed mental conditions – is an unbroken series or chain of negative thoughts.

Every individual must have experienced how the world lights up around them when a pleasant thought surfaces in the mind, and how the world becomes a bitter punishment when an unpleasant thought surfaces.

Low socio-economic status or perceived low socio-economic status can also stimulate feelings of inferiority. The comparison of one's financial ground to another leads to a perceived feeling of inferiority.

The existence of stratification and the identification of one's socio-economic status is nothing but the perception of the individual. To many, it may not hold importance, and to others it may be the only thing worth consideration, but assessment of both conditions brings us back to the initial point of discussion – thought. The thought of the importance of something and the thought of the unimportance of something directs the behaviour of individuals, and the state of happiness or deprivation is merely a result of it.

The common expression of 'a glass being half empty or half full' is used to indicate the difference between an optimist and a pessimist. A pessimist views the 'emptiness' of the glass, which is a negative view, whereas an optimist positively views the 'fullness' of the glass. When simplifying the number of approaches to two basic approaches; what prevails is either positive or negative.

Failure is hence either evaluated positively, where one may try a different approach if they fail at something, or negatively, where instead of analysing the reasons of their failure, they surrender wholly in the face of the problem. A person with an inferiority complex may lose motivation, and failure is met with discouragement and the inability to reform actions, which results in similar future events.

Failure is one of humanity's constant companions; no human is ever exempted from failures or blessed enough to surpass it, hence failure in any phase should not be perceived as negative. Failure is perhaps the evidence of growth and a ticket to future events of achievement.

A point worth consideration is

Inferiority Complex

The cure to an inferiority complex is as simple as the cause.

Unraveling complicated problems from everyday life, the core or the basis of almost all of the problems is found to be instigated by a basic source – thought. Human beings have been seen to possess a tendency to overlook many crucial yet common phenomena; sleep being an example; disturbed sleep cycles lead to a disturbed human. Similarly, the significance of thoughts is only observed when either the flow of thoughts cease wholly – in death, or when the thoughts are considered unhealthy or unusual, termed as either 'illnesses' or 'disorders'.

Negative thoughts are experienced by all individuals, not once but quite a few times in their everyday routines. That being said, the question arises – what is a negative thought and how do we differentiate between negative and positive?

Nature has a pattern of operation, or a system of laws which are to be abided by. 'Positive' is, on a very simplified level, that which follows nature's pattern of operation, and on the contrary, 'negative' is anything that negates the laws of nature. Negative thoughts are constantly countered by positive thoughts in a healthy human being.

Science claims that human thoughts deal with the continuous alteration between negative and positive. It can be commonly observed that a negative thought of harming any organism is mostly countered with sympathy, or a positive thought to protect and refrain from the act of harming.

The persistence of negative thoughts over a long period of time is therefore associated with illnesses or disorders in Psychology. Persistent negative thoughts, without much alteration, shape themselves into a negative thought pattern; the word 'pattern' describes an ongoing chain of thoughts, which can further strengthen and grow to manifest itself into physical diseases by negatively affecting our blood. This can materialise in the form of skin rashes, headaches or even cancer.

An example of a negative thought pattern is an inferiority complex – a possible initial instigator of many other complicated disorders. Inferiority complexes could be said to develop in the early years of childhood; precisely between three to seven years of a child. Susceptible to trauma or any kind of abuse, children are found to be sensitive; to the slightest absences or inattention of their guardians, the non-fulfillment of basic needs and even the deprivation of games or toys.

Through this, the child may compare themselves with their peers and this can instill into their personalities. The initial stages of development and experience are utterly crucial to their personalities and hold considerable importance.

your beloved. How am I your beloved then, if what you really want is to see paradise and fly into the heavens? In this case, paradise, and your desire to fly and wonderwork are your beloved."

What I heard shook me. My eyes welled up, and my heart was burdened with remorse. I stood up, and with heavy steps walked towards my master; I kept my head upon his feet. He took a deep sigh, and held me in an embrace.

• • ——————————— • •

The pleasure of the union with my beloved is still fresh in my memory, and keeps me restless through night and day. Where have I not travelled to seek that pleasure? I visited every nook and corner of paradise, witnessed the beauty in the wings of the angels, in the heights of the heavens, and in the reflection of light in the heavenly bodies of archangels. I roamed around in the strata of hell, and also struggled with death. I saw things that cannot be explained in words, but the pleasure that I found in the union with my dear spiritual master, was not in those sights.

After dying in each moment, I live with the hope that I will seek his nearness. After living every moment, I die in anticipation for the union with my master. When I look within, I see him, and when I look without, I see his reflection.

Ah! Even after so many years, the pleasure that was in that union, has left my soul yearning. There is restlessness. There is anticipation. I live with this belief, die with this faith and will rise again with this conviction that my dear spiritual master will embrace me again in such a way that I will annihilate within him. Nobody will recognise that the master and disciple are two different layers.

May God protect you.

iii

The trustee of the knowledge of the unseen world, Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) states,

> "Man takes a step on the path of God and God forbid; they assume that they have done God a great favour. Why do they not think on how God not only provided them with nourishment in the womb of their mothers, but also arranged food for them during the first 2.15 years of childhood, without making them undergo any form of hardship. God did not charge His creatures a single penny for the oxygen, water and other resources He has provided. He blessed them with the love of a mother and compassion of a father. He bestowed them with kin, honour and health. He also gave them wisdom in order to spend their lives. On average, a person enjoys a life span of about 70 to 80 years. However, despite this short-lived life, they boastfully roam upon the earth created by God. They rebel and assign values to the resources He has given them. Despite all of this, God remembers them at every step of their life."

• • ——————— • •

I am narrating this account from a time where I was undergoing spiritual training. Back then, my life was a haven for doubt and apprehensions. When I stepped on to the path of belief, I was attacked right, left and center by doubts and disbelief. I would often wonder why my prayers to God had been left unanswered over the years. Why was my inner vision not activated despite all the night vigils I performed? I thought I had rights over my spiritual teacher as I had spent days and nights in his service. I wondered why I was kept deprived while others were blessed. When things went beyond control and Satan made me his weapon, I lost all hope.

One day, my kind spiritual teacher addressed me, "Khwaja Sahib, sit down."

As I sat down, he asked, "How am I related to you?"

I answered, "I am your servant."

He said, "Alright, but who am I to you?"

I hesitantly said, "Sir, you are my beloved."

He smiled and said, "The matter is solved in this case. Now tell me, when one sits next to their beloved, does any other thought strike them? If it does, it is an act of disrespect to the beloved. If you are with your loved one, and in the midst of it some other thought surfaces in your mind, it means that the thought which comes to your mind is actually

ii

ing that they deserve so much more and in doing so, they disregard innumerable blessings that God has bestowed upon them.

Once, a wealthy man complained that his friend who had prayed for his father's longevity, had turned away from God because his prayers were not accepted. His friend had spent a huge sum of money to treat his father's ailments, but nothing that he did could save his father's life.

I told him that before anything, his friend's prayer was impractical. "Death and birth are absolute and they are bound to happen. One is rendered helpless before them. How much has your friend paid God for the land he has built his house upon? What would he have done were he born poor or paralysed?"

• • ——————— • •

Dear readers, women and men! Your soul is beautiful, and your mind is brilliant. This brilliance and beauty is not our own accomplishment, rather they are gifts from God, who is the best of all creators.

Hopelessness and upsetting thoughts are part and parcel of this path. During the journey, a wayfarer faces storms, dust and exhaustion. However, a sincere traveler keeps walking on the path even when the destination is beyond their sight. Their sole objective is to reach the destination and hence they remain steadfast in their pursuit of it. As it is a given that all wayfarers face regressive thoughts on the path of spirituality, I have the utmost faith that you will get through it successfully.

You have accepted me as your teacher and I have made you the light of my eyes. It is my responsibility to continually tell you of the labyrinths on this path and it is obligatory upon you to not accept anything transitory, be it big or small, other than the destination on this path. When one arrives at the destination, everything bows before them.

The friends of God are those who are happy. This is why, when your happy face appears sad in my vision, it makes me restless. Do you understand this point?

You and I both have nobody in this world. Someone will leave us, as we will leave many people behind. Our last asset will simply be a two-yard grave, and even that is subjective to availability. In the grave, our body becomes the source of food for insects; our ego transmutes into clay particles, and those particles are then trampled upon by men, cats, dogs, donkeys, buffaloes and other creatures. The crowns and heads of the great kings and the likes of Nimrod, Pharoah, Shaddad, and Korah, have been swallowed by the earth. All of them have transformed into clay particles. Today, we all walk upon them.

• • ——————— • •

i

Message of the Day

In solitude, I was lost in the thoughts of my existence, and I asked myself, "What am I? Where have I come from? Where is the unseen world into which I disappear every day? What does it mean to become *ghaib* (unseen)? How does *ghaib* become *zahir* (seen) and *zahir* return to *ghaib*? What is the mechanism behind this process?"

It is 'His Highness' who is aware of the secret of creation; I am not.

"Where was I before my birth, and how was I manifested here into this world?" When I arrived into this world, the body which is destined to appear from the unseen and disappear into it, began to grow. The growth was such that, when the first day of an infant disappeared, it brought forth the second day. When the second day advanced towards its origin, the third day displayed itself. The infant, climbing on to the stairs of the seen and unseen, arrives back at the junction from where its journey began, and finally vanishes into the unseen world again. That is, the child existed in the unseen world before its arrival into this world, and after manifestation, it disappears once more into the unseen world. The child has no knowledge of when this entire process begins, nor does it know when it will end.

All of sudden, a wave of energy lifted the veils over my mind, and an image displayed before me. The moment I saw it, I realised that it was not a lone image. There were hordes of images placed one after the other. Eventually, all those images fell apart. Some of them slept in their graves, and others settled upon thrones in grand palaces.

> "And We reveal the book unto thee as an exposition of all things, and a guidance and a mercy and good tidings for those who have surrendered." (Quran, 16:89)

• • ——————————— • •

A Spiritual Order is an institute that imparts the knowledge of *ghaib-o -shaood* (The unseen and the seen) and introduces one to happiness. When one enrolls, at first, they are overwhelmed by doubt and hopelessness. This is because Satan's mission is to make people unhappy. He exploits their ego in order to achieve his goal. Consequently, people shrink into the shell of their ego and begin to think of themselves as different to who they truly are. They assume that the little effort they make in the way of God is a huge feat. This weakness drives them into think-

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
Inferiority Complex	Mahnoor Arif	168
Unity in Diversity	Umar Tariq	164
The Drum	Roshan Sitara	159
The Seeker of Peace	Qurat-ul-ain Wasti	156
The Positive Effects of Plants	Moeed Ahmad	149
Circle of Life	Bibi Anuradha (UAE)	145

❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀ ❀

"Surrendering is not a weakness. On the contrary, it is strength. The surrenderer stops living in boiling water and starts living in a secure place."

—Hazrat Shams Tabrezi (RA)

Vol 8 Issue 8 | September 2020 | Muharram _ Safar 1442AH

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor
Khwaja Shamsuddin Azeemi

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.80/- Per issue. Annual subscription Rs.1080/- with Reg. Post (Domestic), US$ 70/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020